ماہنامہ مجلّہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

"مسلمان دنیا کا عاشق اور جاہ و جلال کا شیدا ہو گیا ہے۔ اس کی روح شوقِ شہادت سے بے کیف، تمنائے حیاتِ سرمدی کے نور سے بے بہرہ اور جبین وکراہیت موت کی غلاظتوں سے اٹی ہوئی ہے۔ وہ غیروں کے سایہ کو غنیمت سمجھتا اور غلامی کی زندگی میں مگن ہے۔ انفاق و جہاد کا نام سن کر لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔ تین سو تیرہ مسلمان سارے عرب و عجم کے خلاف علمِ جہاد بلند کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں لیکن یہاں چالیس کروڑ کی جمعیت وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ کی آڑ میں پناہ لے رہی ہے۔ سچ کہیے، کیا یہ لوگ بزبانِ حال اپنے رسول ﷺ کو یہ جواب نہیں دے رہے ہیں کہ اِذْهَبْ أَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ کیا یہودیوں نے اس کے علاوہ کچھ اور کہا تھا؟ فَاعْتَبِرُوْا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ۔"

(مسلمان اور امامت کبریٰ : از مولانا صدرالدین اصلاحی : ص ۴۲)

جامعۃ الفلاح کی ایک اہم ضرورت

تکمیل کے لئے اہل خیر حضرات کی توجہ درکار ہے

جامعۃ الفلاح ہندوستان کی ایک مشہور دینی درسگاہ ہے جہاں طلبہ وطالبات کی ایک کثیر تعداد زیر تعلیم ہے اور ان کی تعلیم وتربیت کے لئے تقریباً دو سو معلمین ومعلمات اور کارکنان مصروف کار ہیں، ان میں بیرونی معلمین ومعلمات وکارکنان کی کثیر تعداد کو قصبہ میں کرایہ کے مکانات کے حصول میں کافی دشواریوں کا سامنا رہتا ہے جس کی وجہ سے انھیں یکسوئی میسر نہیں رہتی ہے۔ اور خود طلبہ کی تعلیم وتربیت کے مفاد میں ہے کہ اساتذہ وکارکنان ان کے درمیان قیام فرمائیں لہذا ادارہ جامعہ کی شدید خواہش ہے کہ جامعہ سے متصل ان کی رہائش کا نظم کیا جائے اس کے لئے ایک قطعہ زمین (تقریباً نصف ایکڑ) خریدی جاچکی ہے جس میں وسیع تر پلاننگ کے تحت تعمیر کا منصوبہ بنایا جاچکا ہے۔ فی الحال اس کے ایک ونگ کی پہلی منزل کی تعمیر پر ۱۲ لاکھ روپے اخراجات کا تخمینہ ہے جو چھ فلیٹ پر مشتمل ہوگا۔ مگر وسائل کی کمی کی وجہ سے یہ تعمیری کام نہیں شروع کیا جاسکا ہے۔

اللہ کے نام پر خرچ کرنے والے بھائیوں سے جن کو اللہ تعالیٰ نے مال کی نعمت سے نوازا ہے ہماری پرزور اپیل ہے کہ اس کام میں دل کھول کر حصہ لیں کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا اجر بے حد وحساب ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"مثل الذین ینفقون أموالهم فی سبیل الله کمثل حبة انبتت سبع سنابل فی کل سنبلة مائة حبة والله یضاعف لمن یشاء والله واسع علیم" (البقرۃ: ۲۶۱)

ان لوگوں کی مثال جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں ایسی ہے کہ جیسے ایک دانہ اس سے اگیں سات بالیں ہر بال میں سو سو دانے اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے واسطے چاہے اور اللہ نہایت بخشش کرنے والا ہے سب کچھ جانتا ہے۔

ہمارے نمائندے آپ حضرات کی خدمت میں حاضر ہوں گے، تمام اہل خیر حضرات دل کھول کر حصہ لیں اگر کسی صاحب کے پاس ہمارے نمائندے نہ پہنچ سکیں تو درج ذیل پتہ پر اپنا تعاون ارسال کریں۔

والسلام

ناظم جامعۃ الفلاح بلریاگنج اعظم گڑھ

یوپی، الہند۔ ۲۷۶۱۲۱

بینک اکاؤنٹ

U.B.I. - A/C No. : 20001

Bilariya Ganj Branch

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ

حیات نو

بلریاگنج

جلد نمبر ۱۵

محرم الحرام ۱۴۲۰ھ

مئی ۱۹۹۹ء

شمارہ نمبر ۵

مدیر مسئول
نور محمد فلاحی

مدیر
عبد البر اثری فلاحی

مدیر معاون
انیس احمد فلاحی

☆ سالانہ زر تعاون : 50.00 روپے

☆ خصوصی زر تعاون : 100.00 روپے

☆ بیرون ملک سے : 25.00 امریکی ڈالر

☆ طلبہ کے لئے : 40.00 روپے

☆ اعزازی زر تعاون : 1000.00 روپے

☆ قیمت فی شمارہ : 5.00 روپے

اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے، لہذا جلد از جلد سالانہ زر تعاون ارسال فرمائیں ◯

مضمون نگار کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ترسیل زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ "مجلہ حیات نو" جامعۃ الفلاح

بلریاگنج، اعظم گڑھ 276121 (یو.پی) فون نمبر 05466-25115

نقوش حیات نو

اداریہ

اسوۂ حسینؓ — عبدالبر اثری فلاحی — ۳

بحث و نظر

عہد عباسی میں فلسفہ اور منطق کی کتابوں کے عربی تراجم — عبدالباری فلاحی — ۷

مدارس اسلامیہ ۔ نظام تعلیم کے مطلوبہ خدوخال — محمد رفیق شہید فلاحی ندوی — ۱۷

شعر و سخن

غزل — ریاض احمد قاصد فلاحی — ۲۵

ہدایت کے چراغ

محمد بن واسع ازدیؒ — ابو جمیس ندوی — ۲۲

مذاہب عالم

نصرانیت — انیس احمد فلاحی — ۳

سیر و سوانح

ذکر جلیل ضمیمہ (۳) — عبدالبر اثری فلاحی — ۳۳

فقہ و فتاوی

اجنبی عورتوں سے مصافحہ کرنا — ابو رقم فلاحی — ۳۹

تعارف تبصرہ

راہ اعتدال — ابو عبدالرحمن عمار فلاحی — ۴۰

جامعہ کے لیل و نہار

ششماہی امتحان، تعطیل کرما، اجلاس مجلس شوری — ادارہ — ۴۳

روداد انجمن

روداد اجلاس شوری — سکریٹری انجمن — ۴۴

خطوط و رسائل — عتیق الرحمن اصلاحی — ۴۹

اسوۂ حسینؓ

عبدالبر اثری فلاحی

نواسۂ رسول ﷺ حسینؓ کی شہادت ایسا حادثہ خونچکاں ہے کہ محبان رسول اس پر جس قدر درد محسوس کریں کم ہے۔ لیکن اصل سوال یہ ہے کہ خود حسینؓ نے کون سا درد محسوس کیا تھا جس کی خاطر اپنی جان عزیز تک قربان کر دی تھی۔

تاریخ یہ بتاتی ہے کہ نہ انھیں کسی نے مارا تھا نہ دعوت مبارزت دی تھی، نہ دعوائے حکمرانی لے کر میدان میں آئے تھے۔ نہ بظاہر ان سے کسی نے اپنا دین چھوڑنے کا مطالبہ کیا تھا کہ ان سے برسر پیکار ہوں، نہ بادی النظر میں شرک و کفر کی بالادستی باقی رہ گئی تھی کہ ان کا زور توڑنا مقصود ہو۔ نہ کسی نے قرآن و سنت کے قوانین کے نفاذ سے انکار کیا تھا کہ اس کا ہوش و حواس ٹھکانے لگانا پیش نظر رہا ہو، پھر آخر وہ کون سی چیز تھی جس کی خاطر اعزہ و احباب کی ساری فہمائش اور پیش بندی کے باوجود اپنے آپ کو عظیم خطرے میں ڈال دیا بلکہ اپنے اہل و عیال کو بھی اس کی نذر کر دیا اور بے سروسامانی کی پرواہ کی نہ حالات اور مصلحتیں آڑے آئیں۔

تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ اسلامی تعلیمات میں سے صرف ایک تبدیل کیا گیا تھا، خلیفہ کا انتخاب ہونا چاہیے تھا لیکن یزید کو ولی عہد بنا دیا گیا تھا۔ بظاہر اس کے بہت زیادہ اثرات و نتائج ابھر کر سامنے نہیں آئے تھے لیکن اس کے باوجود آپ نے اس کے خلاف محاذ آرائی کی کیونکہ آپ یہ محسوس کر رہے تھے کہ یہ بگاڑ اور فساد کا نقطۂ آغاز ہے۔ ابھی تبدیلی کی شروعات ہے اسی وقت اس پر بند باندھنا اور بریک لگانا آسان ہے۔ ورنہ جتنی تاخیر ہوگی اسی قدر اسے روکنا اور اس کی اصلاح کرنا مشکل ہوگا۔

اس سے بڑھ کر یہ احساس کہ اللہ کا ہر حکم اٹل ہے۔ اس میں سے کوئی ایک بھی پامال ہو یہ روا نہیں اور صاحب ایمان کی غیرت کے منافی ہے کہ وہ اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرے۔ آخر علی و فاطمہ کی گودوں میں پلنے والے اور سید الانبیاء کے فیض یافتہ سے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ارثی

ے ان حکم الٰہی کی پامالی انگیز کرے اور اس کے خلاف علم بغاوت بلند کرے۔

میرے خیال میں یہی وہ درد تھا اور یہی وہ احساسات تھے جن کی وجہ سے اپنا سب کچھ نثار کر دیا اور ہم بے بضاعتوں کے لئے یہ اسوہ چھوڑ گئے کہ خواہ حالات ناسازگار نظر آئیں، وسائل و ذرائع مفقود ہوں، بظاہر انجام بہتر بھی نظر نہ آ رہا ہو، پھر بھی ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ احکامات الٰہی کی پامالی کو گوارہ نہ کیا جائے۔ فساد پیدا نہ ہونے دیا جائے اور اس کی خاطر جان عزیز تک قربان کر دی جائے۔ وفقنا اللہ تعالیٰ۔

حسینؓ کے جیتے جی تو صرف ایک حکم پامال ہوا تھا، بگاڑ کا آغاز ہی ہو رہا تھا، لیکن آج ہمارے سامنے سیکڑوں احکامات الٰہی پامال ہو رہے ہیں۔ زمین فتنہ و فساد سے بھر گئی ہے، کفار و مشرکین کو غلبہ حاصل ہے۔ ہمیں مرتد بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ الٰہی قانون کے بجائے انسانی قانون کو نافذ کیا جا رہا ہے اور نہ جانے ہماری ایمانی غیرت کو کتنے کچوکے لگائے جا رہے ہیں لیکن پھر بھی ہماری غیرت نہیں جاگ رہی ہے اور نہ وہ درد و احساس نظر آ رہا ہے جس نے حسینؓ کو تڑپا دیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارا ایمان مردہ ہو چکا ہے، ہم لاشۂ بے جان بن چکے ہیں.....؟ حکمتوں اور مصلحتوں نے ہمیں بزدل بنا دیا ہے اور وسائل و ذرائع کی کمی کے عذر لنگ نے ہمیں اپاہج کر دیا ہے۔

هبوا اعملوا اٹھیے اور ایمان و عمل کا ثبوت دیجیے کہ اسی میں زندگی ہے، سعادت ہے اور نجات ہے۔ اور یہی رسول ﷺ اور ان کے خاندان سے محبت کی دلیل و تقاضہ ہے۔ اسوۂ حسینؓ بھی ہمیں اسی کی طرف پکار رہا ہے۔

توجہ طلب

تمام فلاحی برادران کی علمی کاوشوں کو جمع کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں تمام فلاحی برادران سے گزارش ہے کہ وہ اپنی علمی کاوشیں آفس انجمن طلبہ قدیم روانہ فرمائیں، خواہ وہ تصانیف کی شکل میں ہوں یا ترجمے، پمفلٹ، میگزین وغیرہ شکلوں میں ہوں۔ اس ضمن میں اگر کوئی دشواری محسوس کریں تو اس سے مطلع فرمائیں۔

عہد عباسی میں فلسفیانہ اور طبّی کتابوں کے عربی تراجم

تحریر: ڈی لیسی اولیری
ترجمہ: عبدالباری فلاحی

مسلم فکر کے جدید رخ اور رجحان کے بارے میں جو اہم اشارات ملتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان کتابوں کے عربی تراجم بکثرت کیے گئے جن کا تعلق فلسفیانہ اور سائنسی موضوعات سے تھا۔ نتیجتاً امویوں کے زوال کے ۸۰ سال بعد عربی داں طبقہ کے پاس ارسطو و نو افلاطونی شارحین (Neo-Platonic Commentators) کی معتد بہ کتابیں، افلاطون کی بعض تصنیفات، جالینوس کی بیشتر کتابیں اور طبی مصنفین اور ان کے شارحین کے کچھ حصوں کے عربی تراجم دستیاب ہو گئے۔ ان کے علاوہ دیگر سائنٹفک یونانی کتابوں اور متعدد ہندوستانی و فارسی تحریروں کے عربی ترجمے کثیر تعداد میں موجود تھے۔

ترجمے کے اس اہم دور کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) پہلا حصہ عباسی خلیفہ السفاح کی تخت نشینی سے شروع ہو کر خلیفہ المامون کی تخت نشینی پر ختم ہو جاتا ہے یعنی ۱۳۲ تا ۱۹۸ھ۔ یہ وہ وقت تھا جب متعدد آزاد مترجمین بالخصوص عیسائیوں، یہودیوں اور دوسرے نومسلموں نے کثیر التعداد کتابوں کے ترجمے کیے۔

(۲) دوسرا حصہ خلیفہ المامون اور ان کے دوسرے جانشینوں کی سرپرستی میں شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب ترجمہ کا کام اس اکیڈمی میں مرکوز ہو گیا جس کی بنیاد بغداد میں رکھی گئی تھی۔ وہاں پیہم اس بات کی کوشش کی گئی کہ فلسفیانہ اور سائنسی ریسرچ کے لئے ضروری اور اہم معلومات عربی داں طلبہ کو بہم پہنچائی جائیں۔

ابتدائی تراجم کو خاص طور سے عبداللہ بن المقفع کی جانب منسوب کیا جاتا ہے۔ وہ فارس کا باشندہ تھا اور اصلاً مجوسی تھا۔ اس نے محمد بن علی (السفاح کے والد) کے ایک بھائی کے سامنے اسلام قبول کیا اور اس کا سکریٹری بن گیا۔ وہ اپنے مالک پر بہت اعتماد کرتا تھا۔ اس کو اتنا یقین رہتا تھا کہ اس کو ہر حال میں تحفظ فراہم کیا جائے گا، اسی وجہ سے اکثر عرب عہدیداروں بالخصوص بصرہ کے گورنر سفیان کو برا بھلا کہہ دیا کرتا تھا۔ عام خیال یہی تھا کہ عرب نژاد باشندے جو ابتدائی عباسیوں کے دور میں سیاسی عہدوں پر فائز تھے توہین آمیز کلمات شکر برداشت کر لیتے تھے۔ ایک بار جب خلیفہ المنصور کے چچا عبداللہ بن علی نے منصور کی خلافت کے خلاف بغاوت کی کوشش کی اور اس میں اس کو ناکامی ہوئی تو ابن المقفع کو ہدایت دی گئی کہ وہ ایک امان نامہ تیار کرے۔ اس نے خط کا مضمون ایسے انداز میں تیار کیا جس کو پڑھ کر خلیفہ کو غصہ آ جائے۔ خلیفہ نے خط پڑھ کر ابو سفیان والی بصرہ کو پیغام بھیجا کہ اس شخص کو فوراً سزائے موت دی جائے جس نے یہ امان نامہ تیار کیا ہے۔ اس حکم سے ابو سفیان کو بے حد مسرت ہوئی۔ اس نے موقع کو غنیمت سمجھا اور اپنے ذاتی انتقام کی خاطر ۱۴۲ یا ۱۴۳ھ میں اس کو قتل کروا دیا۔

ابن المقفع گرچہ مشرف باسلام ہو گیا تھا لیکن عام طور سے زندیق[1] کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ المنصور کے حکم کی تعمیل میں یونانی، سریانی اور فارسی سے عربی میں ترجمے کئے گئے۔ اس سے پہلے براہ راست یونانی یا سنسکرت سے فارسی اور سریانی زبانوں میں کتابوں کے ترجمے کئے گئے تھے۔ ابن المقفع کا سب سے مشہور ترجمہ وہ ہے جو اس نے قدیم فارسی سے عربی میں کلیلہ و دمنہ کے نام سے کیا (فارسی میں اسے براہ راست سنسکرت سے منتقل کیا گیا تھا)۔ ابن المقفع کا ترجمہ عربی نثر کا بہترین نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کا فارسی نسخہ تو ضائع ہو گیا لیکن سریانی زبان میں ایک ترجمہ موجود

(۱) مصنف نے زندیق کی وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ ایک اصطلاح ہے جو مانی (Mani) کے پیروکاروں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ عرب مصنفین اس کو عموماً ایسے شخص کے لئے استعمال کرتے ہیں جو ایرانی مذاہب میں سے کسی ایک کا پیرو ہو اور اس نے بظاہر اسلام قبول کر لیا ہو لیکن خفیہ طریقے سے اپنے مذہب سے وابستہ ہو۔ یہ لفظ بذات خود "صدیقی" کا فارسی ترجمہ ہے۔ یہ خطاب مانی فرقے سے تعلق رکھنے والوں کو عطا کیا جاتا تھا۔ وہیں سے یہ خیال وجود میں آیا کہ اصل عقیدہ کو عام عقیدہ (ہر وہ عقیدہ جس کو قبول عام حاصل ہو) سے مخفی رکھا جائے اور ظاہری طور سے دوسرے عقیدہ کا اعلان کیا جائے۔ یہ وہ عمل ہے جو شیعہ فرقہ میں بہت عام ہے۔ مسعودی بیان کرتا ہے کہ بہت سے خیالات اس وقت پیدا ہوئے جب مانی (Mani) ابن دیصان (Ibn Dayson) اور مارکیون (Marcion) کی کتابوں کو ابن المقفع اور دوسرے لوگوں نے فارسی اور پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا۔

ہے۔ اس کو نسطوری مشنری بدھ نے تقریباً ۵۷۰ء میں فارسی سے کیا تھا اور وہ شائع ہو چکا ہے (ایڈیشن Bicket & Benfey ۱۸۷۱ء)۔ اسی طرح اصل سنسکرت کتاب بھی مرورِ ایام کے ساتھ ضائع ہو گئی البتہ اس کا مواد کافی حد تک سنسکرت کی دو کتابوں میں موجود ہے۔ اور وہ ہیں:

(۱) پنچ تنتر۔ یہ ان کہانیوں پر مشتمل ہے جو De Sacy کے عربی متن (۵، ۷، ۸، ۹، ۱۰ اور ۱۱) میں نمایاں ہیں۔

(۲) مہابھارت۔ جس میں ابواب ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ شامل ہیں۔

بدھ نے فارسی سے سریانی زبان میں جو ترجمہ پیش کیا اس سے متن کی قدیم ترین صورت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے لیکن ابن المقفع کے عربی ترجمہ میں بہت سے حذوفات اور اضافات ہیں جن کی جھلک ان نسخوں میں نظر آتی ہے جو بعد میں منظر عام پر آئے مثلاً سریانی زبان کے نسخے، عہد وسطیٰ کے متعدد فارسی ترجمے جو قدیم فارسی کے بجائے براہ راست عربی سے کئے گئے، متعدد لاطینی، عبرانی، اسپینی، فارسی، یونانی نسخے۔ دراصل یہ عربی ترجمہ ہی تھا جس کی وجہ سے اس کتاب کو پہلے کے مقابلے میں شہرت ملی اور مغربی دنیا میں اسکا تعارف ہوا۔ اس کا معاملہ بالکل وہی تھا جو ارسطو کا تھا۔ عربی زبان تبادلہ خیالات اور اظہار فکر کا ذریعہ بن گئی اور جو اضافات کئے گئے ان کی بھی اشاعت بڑے پیمانے پر عربی زبان کی وجہ سے ہوئی۔

ابن المقفع نے خلیفہ المنصور کے دور حکومت میں زندگی گزاری اور اسی دور میں ارسطو کے متعدد رسالوں، بطلیموس کی المجسطی، اقلیدس کی کتاب اور ان کے علاوہ دوسری کتابوں کو یونانی سے عربی میں منتقل کیا گیا۔ تقریباً ۱۵۶ھ میں ایک ہندوستانی سیاح بغداد گیا اور اپنے ہمراہ دو کتابیں لے گیا جن میں سے ایک علم حساب اور دوسری علم نجوم سے متعلق تھی۔ آخر الذکر کا نام سدھانت تھا جس کو عربی مصنفین "سند ہند" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس کو ابراہیم الفزاری نے عربی زبان کے قالب میں ڈھالا اور علم نجوم میں دلچسپی رکھنے والوں کے لئے جدید معلومات فراہم کیں۔ کچھ عرصہ کے بعد جب محمد بن موسیٰ خوارزمی نے علم نجوم سے متعلق یونانی اور ہندوستانی آراء اور خیالات کو ضم کیا تو اس مضمون کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا اور یہ عربی مطالعات کا ایک جزو بن گیا۔ عربی مصنفین میں جن لوگوں نے اس میدان میں عظمت اور شہرت حاصل کی ان میں سے ایک البلدا کا ابو معشر (متوفی ۲۷۲ھ، ۸۸۵ء) تھا جس کو عہد وسطیٰ کے لاطینی مصنفین Abumazar کے نام سے یاد کرتے تھے۔ وہ الکندی کا شاگرد تھا۔ دوسرا شخص محمد بن جابر بن سنان البتانی

(متوفی ۳۱۷ھ / ۹۲۹ء) تھا جو Albategnius کے نام سے موسوم تھا۔

جہاں تک اول الذکر یعنی علم حساب کا تعلق ہے اس میں ہندوستانیوں نے اہم کارنامے انجام دیئے۔ انہوں نے اعداد کو متعارف کرایا۔ اس کے بعد عربی اعداد وجود میں آئے۔ عدد شماری کے اس Decimal system کی وجہ سے حسابیاتی طریقوں (Arithmatical Process) میں اور صحیح معنوں میں اس علم ریاضی میں عمومی طور سے وسعت پیدا ہوئی جس کا کسی بھی حیثیت اور قدیم نظام کے ساتھ ہونا مشکل ہوتا ہے۔

۱۴۸ھ / ۷۶۵ء میں بغداد کی بنیاد رکھنے کے بعد خلیفہ المنصور نے ایک نسطوری طبیب جورجیس بختیشوع کو مدرسہ جندیشاپور سے طلب کیا اور اس کو اپنا درباری طبیب مقرر کیا۔ اسی وقت سے نسطوری اطباء کی آمد اور دربار سے وابستگی کا سلسلہ شروع ہوا اور بغداد میں ایک طبی اسکول کا قیام عمل میں آگیا۔ جورجیس جب بغداد میں بیمار پڑا تو اس نے جندیشاپور جانے کی اجازت طلب کی۔ خلیفہ نے اس شرط پر بغداد چھوڑنے کی اجازت دی کہ وہ اپنی جگہ پر کسی ماہر طبیب کو نامزد کر دے۔ چنانچہ اس نے اپنے شاگرد عیسیٰ کو نامزد کیا جس نے معالجات پر ایک کتاب لکھی۔ اس کے بعد جورجیس کا بیٹا بختیشوع مقرر ہوا جس نے ۱۷۱ھ / ۷۸۷ء میں طبیب خاص کی حیثیت سے ہارون رشید کی خدمت انجام دی۔ پھر جورجیس کا دوسرا بیٹا آیا جو ۱۷۵ھ / ۷۹۱ء میں جعفر برمکی کی خدمت میں لگا رہا اور بہت جلد بلند مقام حاصل کر لیا۔ اس نے منطق کو متعارف کرایا، غذائیات اور مشروبات پر مامون کے پاس ایک خط لکھا، طب پر ایک کتابچہ تیار کیا جس کی بنیاد دیسقوریدس، جالینوس اور پولس اجانیطی (Paul of Aegina) کی کتابوں پر تھی، عشق فصول تیار کئے اور خوشبودار اشیاء پر ایک رسالہ قلمبند کیا۔

جہاں تک جندیشاپور میں نظام طب کا تعلق ہے تو وہاں ہندوستانی نظام طب کو روشناس کیا گیا اور یونانی نظام کے ساتھ مربوط کیا گیا لیکن بتدریج آخر الذکر نظام (یونانی نظام طب) کا تسلط ہوا۔

بغداد کا دوسرا اہم طبیب ایک یہودی سریانی تھا جس کا نام ماسرجویہ تھا۔ اس نے اہرن القس کی کتاب الکناش کو سریانی زبان میں منتقل کیا۔

ایک طویل مدت تک عربی زبان میں طب سے متعلق جو کام ہوا وہ عظیم یونانی شخصیات کی کتابوں کے ترجمہ اور اسکندریہ میں حاصل شدہ علم کے مطابق پریکٹس (مزاولت) تک محدود تھا۔ یہاں یہ واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ جو غلط اثرات پیدا ہوئے وہ دراصل مصری اسکول کی دین ہیں۔

مصری اسکولوں نے طب اور کیمیا کو نیم ساحرانہ خطوط پر گامزن کیا جس سے عربی اسکول بھی نجات حاصل نہ کر سکے۔

عربی دنیا میں طبی موضوعات پر تحقیق و تصنیف کا کام ایک طویل مدت کے بعد شروع ہوا۔ تیسری صدی ہجری کے آخر میں ایک نام ابو العباس احمد سرخسی کا ملتا ہے جو الکندی کا شاگرد تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے روح پر ایک رسالہ لکھا۔ فرفوریوس (Prophyry) کی ایساغوجی (Isagoge) کی تلخیص تیار کی اور ایک تعارفی کتابچہ لکھا۔ اس وقت طبی مطالعہ سے سب سے زیادہ دلچسپی عیسائیوں اور یہودیوں کو تھی۔ اسی صدی کے آخر میں ایک سریانی طبیب یحییٰ بن سراپیون کا ذکر ملتا ہے جس نے سریانی میں طبی مقالات لکھے جس کے دو ایڈیشن شائع ہوئے۔ آخر کے ایڈیشن کا متعدد ترجمہ نگاروں نے عربی میں آزادانہ ترجمہ کیا۔ اس کے کافی عرصہ بعد جرارڈ آف کریمونا نے لاطینی میں منتقل کیا۔

طب عربی کا ایک ممتاز طبیب ابو بکر محمد بن زکریا رازی (متوفی ۳۱۱-۳۲۰ھ / ۹۲۳-۹۳۲ء) تھا جس کو عہد وسطیٰ کے لاطینی مصنفین Rhazaa کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ موسیقی، فلسفہ اور طب کا طالب علم تھا۔ اس نے اپنی تحریروں میں یونانی اور ہندوستانی دونوں حوالوں کو استعمال کیا۔ اسکندریہ میں جو اہم اور مستند غذا استعمال کئے جاتے تھے ان کے ماتحت ہندوستانی استاد کا بھی تعارف پیش کرنا سائنس کی ترقی کے لئے ایک کارنامہ تھا جس کو عربی طب نے انجام دیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ رازی کی کتابوں میں نظم و ترتیب کی کمی ہے اور یہ کتابیں کم و بیش الگ الگ رسالوں کا مجموعہ ہیں جن کا استعمال بہت آسان نہیں ہے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ ابن سینا نے جو کتابیں لکھیں ان میں اس کا لحاظ رکھا۔ لیکن اس سے یہ غلطی سرزد ہوئی کہ ترتیب و تنظیم میں حد سے تجاوز کر گیا۔ مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ عربی مصنفین کا حال سریانی مصنفین کے حال سے مختلف نہ تھا۔ سرکردہ طبی مصنفین منطق کی بھی شرح بیان کرتے تھے اور ارسطو و جالینوس کی کتابوں کی بھی تفسیر تیار کرتے تھے۔

خلیفہ المنصور ایسا سرپرست تھا جس نے بغداد میں نسطوری اطباء کو طلب کیا اور ایک ایسا شہزادہ بھی تھا جس نے ان لوگوں کی ہمت افزائی کی جنہوں نے یونانی، سریانی اور فارسی کتابوں کے عربی ترجمے پیش کئے۔ اس سے بڑھ کر خلیفہ المامون نے یہ کارنامہ انجام دیا کہ اس نے ۲۱۷ھ / ۸۳۲ء میں بغداد میں ایک اسکول کی بنیاد رکھی جس کے قیام کے لئے نسطوریوں نے تجویز پیش کی تھی اور پہلے سے قائم زرتشتی اسکولوں نے رجحان پیدا کیا تھا۔ خلیفہ نے اس کا نام بیت

الحکمت رکھا اور یحییٰ ابن ماسویہ (متوفی ۲۴۳ھ / ۸۵۷ء) کو اس کا نگران مقرر کیا جس نے سریانی اور عربی دونوں میں مستقل خدمات انجام دیں۔ وہ یونانی زبان پر بخوبی قادر تھا۔ اس کی کتاب الحمیات کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد لاطینی اور عبرانی میں اس کے ترجمے بھی شائع ہوئے۔

اس اکیڈمی (بیت الحکمت) میں سب سے اہم خدمات یحییٰ کے شاگردوں اور جانشینوں بالخصوص ابو زید حنین بن اسحٰق عبادی (متوفی ۲۶۳ھ / ۸۷۶ء) نے انجام دیں۔ حنین بن اسحٰق ایک نسطوری طبیب تھا۔ اس نے بغداد میں یحییٰ کے زیر نگرانی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد وہ اسکندریہ چلا گیا جہاں یونانی علوم سیکھنے میں مصروف رہا۔ وہاں سے جب بغداد آیا تو اس اولین طبی اسکول سے صرف تربیت ہی حاصل کر کے نہیں بلکہ اہل یونان کے بہترین علم سے مزین و آراستہ ہو کر لوٹا۔

حنین کے ساتھ اس کا بیٹا اسحٰق اور بھتیجا حبیش بھی شریک کار تھے۔ حنین نے عربی زبان میں اقلیدس (Euclid) کا ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ جالینوس، ارشمیدس (Archimedes) ابلونیوس (Appollonius) اور دیگر مصنفین کے متعدد حصوں کا، افلاطون کی کتاب طیماؤس اور الجمہوریہ کا، ارسطو کی کتاب المقولات، کتاب السماع الطبیعی، کتاب الاخلاق، کتاب المعادن (جو علم کیمیا کے موضوع پر مستند ماخذ کی حیثیت سے استعمال ہوتی رہی) اور الٰہیات کی کتاب ۳۰ پر ثامسطیوس نامی فلسفی (متوفی ۳۹۵ء) کی شرح کا اور فولس اجانیطی کی کتاب الکناش کا ترجمہ کیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے بائبل کا بھی عربی ترجمہ کیا۔

حنین بن اسحٰق کے بیٹے ابو یعقوب اسحٰق نے طبی موضوعات پر کتابیں لکھنے کے علاوہ کچھ مصنفین کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ بھی کیا مثلاً افلاطون کی کتاب سوفسطس، ارسطو کی کتاب مابعد الطبیعہ، کتاب النفس، اور کتاب الجبارة (جس کا ترجمہ حنین نے سریانی زبان میں کیا تھا) اس نے فرفوریوس (Prophyry)، اسکندر افرودیسی (Alexander of Aphrodisias) اور امونیاس (Ammonius) کی کچھ شرحوں کا بھی عربی ترجمہ کیا۔

ایک اور شخص جس نے ترجمہ کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دیں اس کا نام قسطا بن لوقا تھا وہ نسلاً سریانی عیسائی اور بعلبک کا باشندہ تھا اس نے یونان میں تعلیم حاصل کی تھی۔

چوتھی صدی ہجری کو عربی مترجمین کا زریں دور کہا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ ترجمہ کا کام خاص طور سے سریانی کے ماہر عیسائیوں نے کیا جو سریانی روایت سے مسحور تھے تاہم یہ اہم

بھی قابل ذکر ہے کہ بہت سے ترجمے براہ راست یونانی زبان سے کیے گئے اور یہ کارنامہ ان لوگوں نے انجام دیا جنھوں نے اسکندریہ میں یا یونان میں مطالعہ کیا تھا۔ زیادہ تر ایسے ہی اسکالروں نے یونانی سے سریانی اور عربی میں ترجمے کیے۔ بعض ترجمہ نگار ایسے بھی تھے جو سریانی سے ترجمہ کرتے تھے لیکن عام طور سے ایسے مترجمین کا نام ان کے بعد آتا ہے جو یونانی سے ترجمہ کرتے تھے۔

نسطوریوں میں جو سریانی سے ترجمہ کرنے میں مہارت رکھتے تھے ان میں ابو بشر متی بن یونس (متوفی ۳۲۸ھ / ۹۴۰ء) کو اہم مقام حاصل تھا۔ اس نے سریانی سے عربی میں کچھ کتابوں کا ترجمہ کیا اور وہ ہیں: ارسطو کی کتاب بوطیقا (الشعر) کتاب انالوطیقا ثانیہ (البرہان) اور اسی کی کتاب الکون والفساد پر افرودیسی کی لکھی ہوئی شرح اور کتاب مابعد الطبیعہ کے جز ۳۰۷ پر ثامسطیوس فلسفی کی شرح۔

ان تراجم کے علاوہ اس نے ارسطو کی کتاب قاطیغوریاس (المقولات) اور فرفوریوس کی ایسا غوجی کی شرحیں بھی لکھیں۔

نسطوریوں کے بعد یعقوبی مترجمین کا نمبر آتا ہے۔ ان میں سے جو لوگ سریانی سے عربی میں ترجمہ کرنے پر قادر تھے وہ تھے یحییٰ بن عدی (متوفی ۳۶۴ھ / ۹۷۵ء) اور ابو علی عیسیٰ بن زرعہ (متوفی ۳۹۸ھ / ۱۰۰۸ء)

اول الذکر حنین کا شاگرد تھا۔ اس نے بہت سے نسخوں پر نظر ثانی کی اور ارسطو کی چار کتابوں یعنی المقولات، سوفسطس، الشعر، مابعد الطبیعہ کو اور افلاطون کی دو کتابوں یعنی الجمہوریہ اور طیماؤس کے علاوہ کتاب المقولات پر اسکندر افرودیسی کی شرح اور اخلاق فاضلہ پر ثاوفرسطس (Theo-phrastus) کی شرح کے بھی ترجمے کیے۔

آخر الذکر یعنی ابو علی عیسیٰ بن زرعہ نے تین کتابوں کے ترجمے کیے (۱) المقولات (۲) الطبیعیہ (۳) اعضاء الحیوان ان میں John Philoponus کی شرح بھی شامل تھی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ارسطو سے متعلق اس ذخیرہ معلومات کو بالاختصار بیان کر دیا جائے جو فلسفہ کے عربی طلبہ کے پاس موجود تھا۔ ارسطو کی کتاب ارغنون (Organon) کا مکمل حصہ عربی زبان میں تھا اور اس میں ریطوریقا (الخطابۃ) اور بوطیقا (الشعر) کے علاوہ فرفوریوس کی کتاب ایساغوجی بھی شامل تھی۔ نیچرل سائنس پر کتاب السماع الطبیعی، کتاب السماء والعالم، کتاب الکون والفساد، کتاب الحس والمحسوس، کتاب الحیوان، کتاب الآثار العلویہ، کتاب النفس اور الٰہیات پر کتاب مابعد الطبیعہ نیقوماخس اخلاقیات اور کتاب الاخلاق ان کے پاس دستیاب تھیں۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ارسطاطالیسی قانون میں کتاب السیاستہ شامل نہیں تھی بلکہ اس کی جگہ پر افلاطون کی کتاب الجمہوریہ یا نوامیس شامل تھی۔ ان کے علاوہ معدنیات اور دیگر کئی علم کو ارسطو ہی سے متعلق خیال کرتے تھے۔

مذکورہ بالا کتابوں میں سے ارسطو کی کتاب ارغنون (Organon) کو اخلاقی موضوع پر اساسی حیثیت حاصل تھی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کے اس مادی منطقی بنیاد پر اثر اس نظام کی وجہ سے پڑا جس کی نشو ونما اہل شام کے درمیان ہوئی۔ یہ امر ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اسی طرح کا ایک نظام الاعلیٰ کتب فکر میں عربی مصنفین کے ساتھ ربط و تعلق قائم ہونے سے پہلے آزادانہ طور سے نشو ونما پا چکا تھا۔ ارسطو کی منطق قدیم نوعیت کی تھی، اسی لئے سائنس کو قبول کرتی رہی۔ فلسفیانہ و دینیاتی اختلافات اور اس ضمن میں عربی فلاسفہ کی ترقیاں خاص طور سے مابعد الطبعیات اور نفسیات کے سوالات کا محور و مرکز بنی رہیں۔ اور اسی وجہ سے ان کا تعلق ارسطو کی کتاب مابعد الطبیعیہ کی بارہویں کتاب اور اس کے رسالہ النفس (بالخصوص تیسری کتاب) سے قائم رہا جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ ارسطو کا علم نفسیات اسکندر افرودیسی کی شرح پر مبنی ہے اس طرح اس میں عقیدہ وحدانیت اور مافوق الفطرت کا رنگ شامل ہو گیا اور اس میں مکمل تجرد اور عروج نو افلاطونی سلسلے ورس سے آیا۔ اس افلاطونی اصول کے فروغ میں سب سے اہم رول ارسطو کی کتاب مابعد الطبیعیہ نے ادا کیا جو عربی زبان میں تقریباً ۲۲۶ھ میں منظر عام پر آئی۔ یہ دراصل فلوطینوس (Plotinus) کی کتاب en-neads کی آخری تین فصلوں (۴، ۵ اور ۶) کی تلخیص ہے جس کو Emessa کے Naymal نے تیار کیا۔ اس کی بکثرت اشاعت ہوئی اور ارسطو کی اصل کتاب کی حیثیت سے قبول عام حاصل ہوا۔ یہ ایک قسم کا فریب اور دھوکا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فلوطینوس کو Plato کے نام سے غلط فہمی ہو گئی ہو جس کو عربی میں افلاطون کہا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی غلط فہمی کچھ دوسرے مصنفین کو بھی ہوئی تھی اور مترجمین نے اس بات کو جس کو نو افلاطونی شارحین نے برقرار رکھا تھا تسلیم کر لیا تھا کہ ارسطو اور افلاطون درس و تدریس میں یکساں ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ایسا سطحی فرق ہے جس کو بآسانی واضح کیا جا سکتا ہے۔

علوم الٰہیہ کی مدد سے نو افلاطونیوں کے ترقی یافتہ اصولوں کی عمومی اشاعت ہوئی اور اسکندر افرودیسی کی تعلیمات کے ساتھ شامل ہو گئی۔ اس طرح سے مختلف جہات میں فلسفہ اسلام پر ان

اصولوں کا گہرا اثر پڑا۔ نام نہاد فلاسفہ کے ہاتھوں ایک اسلامی نو افلاطونیت کو فروغ حاصل ہوا جس کو آخری اور کلی شکل دینے کا سہرا ابن رشد اور ابن سینا جیسے عظیم فلسفیوں کے سر ہے اور اس شکل نے اسلامی مکتب فکر پر زبردست اثر پیدا کیا۔ جب یہ دوسرے ماحول میں منتقل ہوا تو تصوف پر اثر انداز ہوا اور اس تصوف نے تصوراتی دینیات کو جنم دیا۔ ان دونوں ذرائع سے جو اصول بھی ملے ان میں سے کچھ بدلی ہوئی شکل میں راسخ العقیدہ مسلمانوں کے دینی مکتب فکر میں داخل ہو گئے۔

اس نو افلاطونی اصول (جس کا شمار مسلم دینیات میں ہوتا ہے) کے مخصوص نکات سے یہ نکلتا ہے کہ عقل فعال (Active Intellect) خدا کا ایک مظہر ہے اور عقل ہیولانی (Passive Intellect) صرف انسان کے اندر اس ایجنٹ عقل کے عمل سے ہی حرکت میں آتی ہے جو اصلاً اسکندر افرودیسی کا اصول ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کا مقصد اتصال حاصل کرنا ہے جس میں اس کی عقل ایجنٹ عقل کے ساتھ مل جاتی ہے باوجودیکہ فلاسفہ اور صوفیاء کے اصولوں میں حصول اتصال کے ذریعہ اور اس کی نوعیت کے ضمن میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

فلسفہ کے بعد علم طب سب سے اہم ورثہ ہے جسے عربی دنیا نے یونانیت سے حاصل کیا لیکن اس علم طب میں جو کہ اسکندریائی ذریعہ سے اخذ کیا گیا ایک اہم خامی ہے اور اس کی اور خامی کا تعلق ان اضافات سے ہے جو بعد کے مصری اسکول نے بقراط اور جالینوس کی خالص تعلیمات میں کئے۔ یہ اضافات نصف جادوئی نوعیت کے ہیں اور ان سے ایسے خیالات و تصورات پر مبنی نظریات کا علم ہوتا ہے جن کو بعد رفتہ جادوگار رجحان دیا جاتا ہے۔

اصل تحریک منتقل شدہ یونانیت سے پیدا ہوئی لیکن فلسفہ خاص میں اس تحریک کا جو اثر ظاہر ہوا اس کے ذمہ دار نسطوری تھے اور طب میں اس کے ذمہ دار نسطوری اور زرتشتی اسکول دونوں تھے۔ پھر حران میں غیر اہل کتاب کے اسکول کی تحریک شروع ہوئی جس میں نو افلاطونی رجحان بھی موجود تھا۔

ایک واقعہ کا ذکر ہے کہ عباسی خلیفہ المنصور جب بازنطینی بادشاہ کے خلاف جنگ کے لئے جاتے ہوئے راستہ میں حران سے گزرا تو وہاں کے شہریوں کی عجیب و غریب حالت دیکھ کر حیران رہ گیا جو اس سے ملنے کے لئے گئے تھے۔ ان کے بال لمبے اور لباس بہت چست تھے۔ خلیفہ نے جب ان سے پوچھا کہ وہ عیسائی ہیں یا یہودی یا مجوسی؟ تو جواب ملا کہ کچھ بھی نہیں۔ خلیفہ نے پھر پوچھا۔ کیا اہل کتاب ہیں؟ کیونکہ مسلم حکومتوں میں انہی لوگوں کو برداشت کیا جاتا تھا جن کے پاس کوئی الہامی

کتاب ہو۔ انہوں نے خلیفہ کو ایسا مبہم جواب دیا جس سے اس کو اطمینان ہو گیا کہ اس نے ملحدوں کی ایک کالونی کا پتہ لگایا۔ پھر ان کو حکم دیا وہ اس کی جنگ سے واپسی سے پہلے "مذاہب کتاب" میں سے کسی ایک کو اختیار کریں یا پھر سزائے موت کے لئے تیار رہیں۔ اس حکم سے وہ خوف زدہ ہو گئے۔ بعض مسلمان ہو گئے۔ بعض نے عیسائیت، اور بعض نے صیہونیت کو قبول کر لیا۔ البتہ بعض نے اپنے روایتی عقیدہ کو چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ اس انکار سے منکرین کی حالت ابتر ہونے لگی۔ وہ برابر خلیفہ کے حکم کی تعمیل سے بچنے اور کترانے کی کوشش کرتے رہے۔ بالآخر ایک مسلم وکیل نے انکو اس مشکل سے نجات دلانے کے لئے خود کو اس شرط پر پیش کیا کہ مسئلہ حل ہونے کے بعد مناسب اجرت دی جائے۔ جب اس کی پیش کش قبول کر لی گئی تو اس نے ان کو صابی ہونے کا مشورہ دیا کیونکہ قرآن مجید کے مطابق ان کا تعلق مذاہب کتاب میں سے ایک مذہب سے ہے۔ اس نے ایسا مشورہ اس لئے دیا کہ کسی کو یہ علم نہیں تھا کہ صابی[1] کون ہوتے ہیں؟

خلیفہ منصور پھر کبھی حران سے نہیں گزرا۔ جن لوگوں نے صابی نام رکھ لیا تھا وہ برابر اسی پر قائم رہے۔ جو لوگ عیسائی یا صیہونی ہو چکے تھے وہ اپنے قدیم مذہب پر لوٹ آئے اور نئے نام کو قبول کر لیا۔ جو لوگ مسلمان ہو چکے تھے وہ حالت اسلام پر قائم رہے کیونکہ ان کو اس بات کا علم تھا کہ جو شخص مذہب اسلام سے برگشتہ ہو جاتا ہے اسکو سزائے موت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

حران کا ایک ممتاز شخص ثابت بن قرہ (متوفی ۲۸۹ھ / ۹۰۲ء) تھا جس کو سریانی، یونانی اور عربی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ اس نے منطق، نجوم اور طب کے علاوہ اس عقیدہ پر بھی کتابیں لکھیں جس سے وہ منسلک تھا۔ اس کے پیروکاروں میں اس کا بیٹا ابو سعید سنان، اس کے پوتے ابراہیم اور ابو الحسن ثابت اور پڑپوتے اسحٰق اور ابو الفرج شامل تھے۔ ان سب کو حساب اور نجوم میں غیر معمولی مہارت حاصل تھی۔

ایک اور عظیم فرد جس کا تعلق حران سے تھا اس کا نام جابر بن حیان تھا۔ گرچہ اس کو تاریخی

---

(۱) صابی ایک فرقہ ہے جس کا مذہب قدیم بابلی اصنعیت کی پرستش، عیسائی غناسطیہ (Christian Gnosticism) اور صیہونیت کا عجیب و غریب مرکب ہے۔ یہ قوم بصرہ اور سواحل خلیج العرب کے قریب آباد ہے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے مذہبی عقیدہ کو غیروں سے مخفی رکھنے میں محتاط رویہ اختیار کیا۔ گرچہ ان کا تعلق اسی فرقہ سے تھا جس کا ذکر قرآن میں صابئون کے نام سے کیا گیا ہے تاہم کوئی اس کو ثابت نہیں کر سکا کہ حران کے غیر اہل کتاب بھی اس اصطلاح کے تحت آتے ہیں یا نہیں۔

حیثیت حاصل ہے لیکن اس کی تاریخ قدرے غیر یقینی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اموی شہزادہ خالد کا شاگرد تھا اس کو علم کیمیا میں ریسرچ اور تحقیق کی وجہ سے نمایاں مقام حاصل تھا۔ جابر کی طرف بہت سے رسالے منسوب ہیں لیکن ان میں سے چند ہی ایسے معتبر اور مستند ہیں۔

ایم برتھیلوٹ (M Berthelot) نے اپنی کتاب La chimie au moyen age (مطبوعہ پیرس ۱۸۹۳ء) کی تیسری جلد میں عربی کیمیا دانوں کا محتاط تجزیہ کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ سارے مواد کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جس میں اسکندریہ کے یونانی کیمیا دانوں کی تحقیقات کا اعادہ کیا گیا ہے اور دوسرا وہ جس میں اصل تحقیق کو پیش کیا گیا ہے گرچہ وہ تحقیقات اسکندرانی مطالعات پر مبنی ہیں۔ وہ ان تمام اصل مواد کو جابر بن حیان کی جانب منسوب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ کیمیا میں اس کو وہی مقام تھا جو ارسطو کو منطق میں۔ برتھیلوٹ نے اپنی اس کتاب میں چھ رسالوں کا ذکر کیا ہے جن کے بارے میں اس کا دعوی ہے کہ وہ جابر کی تصنیفات ہیں اور تمام عربی کیمیاوی مواد کی رہنما اور رہبر ہیں۔ بعد کے اہل تحقیق انہی خطوط پر چلتے رہے جن کو خود جابر نے متعین کر دیے تھے۔

پہلے طویل عرصہ تک علم کیمیا کا خاص مقصد دھاتوں کی ماہیت کو تبدیل کرنا تھا لیکن بعد میں علم طب سے اس کا گہرا تعلق قائم ہو گیا تاہم اس کی دھات صاف کرنے والی صفت کبھی ختم نہیں ہوئی جس کا اطلاق اس وقت ہوتا ہے جب ہم "الکیمیا" کا لفظ بولتے ہیں۔ علم کیمیا کے عربی طبہ کا جدید سائنس دانوں کے مقصد سے میل نہیں کھاتا ہے باوجودیکہ عناصر کی تبدیلی ماہیت ایسا خواب نہیں ہے جو انیسویں صدی کے کیمیا دانوں کے لئے ناممکن رہا ہو۔ اسی طرح یہ بھی سچ ہے کہ کچھ تسلیم شدہ حدود کے ساتھ عربی کیمیا داں بھی محقق تھے البتہ جو تجربات وہ کرتے تھے ان کے نتائج کو اچھی طرح نہیں سمجھتے تھے۔

ایم برتھیلوٹ نے جن متون (Texts) کو شائع کیا ہے ان کے شروع میں اس امر سے متنبہ کیا گیا ہے کہ فہرست مضامین کو مخفی رکھا جائے۔ ان میں یہ بیان بھی شامل ہے کہ کسی ضروری طریق عملی (Process) کو اس وجہ سے چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ تاریک خیال طالبعلم کامیابی کے ساتھ تجربات نہ کر سکیں۔ ورنہ ایسا ہو سکتا ہے کہ سونے کی تحریک پیدا ہو اور سے تمام نسل انسانی تباہ و برباد ہو جائے۔

بلاشبہ عربی کیمیا دانوں نے یہ دعوی کیا تھا کہ انہوں نے کھوٹے دھات کو سونے میں تبدیل

کرنے کے طریقوں کو معلوم کر لیا ہے لیکن تاریخ کی کتابوں میں ایسے متعدد حوالے ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دعووں پر معاصر مفکرین نے تنقیدیں کی تھیں اور بہت سے عربی مصنفین نے علم کیمیا کو محض ایک فریب اور دھوکا قرار دیا تھا۔ کتابوں میں اکثر اس امر کا ذکر ملتا ہے کہ فارابی جو اس پر یقین رکھتا تھا کہ دوسرے دھاتوں کو سونے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور جس نے خود اس موضوع پر کتاب بھی لکھی وہ بہت غریب تھا اور غربت و افلاس کی حالت میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کے برعکس ابن سینا کو کیمیا پر یقین نہیں تھا اور اس نے بہت ہی پاک صاف اور آرام دہ زندگی گزاری۔ اگر وہ مال و دولت کو قبول کر لیتا تو کافی مالدار ہوتا۔

عہد وسطیٰ کے دوران جابر کے متعدد رسالوں کو لاطینی زبان میں منتقل کیا گیا جن میں مصنف کو گیبر (Geber) کے نام سے پیش کیا گیا۔ ان رسالوں کے اثرات کی وجہ سے ایک مغربی مکتب کیمیا وجود میں آیا اور بہت جلد مغربی یورپ میں اصل کیمیاوی کتابوں کی اشاعت شروع ہو گئی جن میں سے بیشتر گیبر (Geber) کے نام سے منسوب تھیں۔ لیکن یہ سب فرضی اور جعلی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جابر کی شخصیت نصف افسانہ بن گئی۔ اس کی زندگی، موت اور اس مسلک اور اس صدی کے بارے میں جس میں وہ زندہ تھا متضاد بیانات دیے جانے لگے اور یہ آواز اٹھنے لگی کہ کچھ اور لوگ بھی رہے ہوں گے جو اسی نام سے جانے جاتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ جابر نے بہت جلد کیمیا کے مصنف کی حیثیت سے بلند مقام حاصل کر لیا تھا لیکن بعد کے لوگوں میں کئی غیر مستند کتابوں کو اس کی جانب منسوب کر دیا گیا۔ برتھیلوٹ کا خیال ہے کہ جابر بن حیان کا تعلق حران سے دوسری صدی ہجری کے اوائل میں تھا۔

عربی کیمسٹری میں بڑے پیمانے پر اسکندریہ کے یونانی کیمیادانوں کے خیالات نقل کیے گئے ہیں۔ البتہ اس کی تہ میں مقامی مصری طبقہ کے اثرات کی بھی جھلک نظر آتی ہے۔ جے رسکا (J.Ruska) اپنی کتاب Tabula Smaragedlana (مطبوعہ ۱۹۲۶ء) میں لکھتا ہے کہ سارا مواد عربی میں قبطی زبان کے توسط سے منتقل کیا گیا لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہوا۔ قبطی متون سے پتہ چلتا ہے کہ ان سب کا ترجمہ اصل عربی زبان سے کیا گیا ہے۔

مدارس اسلامیہ نظام تعلیم کے مطلوبہ خد و خال

غطریف شہباز ندوی فلاحی

نظام تعلیم کسی بھی قوم کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلامی تاریخ میں تعلیم و تربیت اور اس کے مراکز کی ایک شاندار تاریخ رہی ہے۔ یہ مراکز ہی اسلام کے "سرچشمہ قوت" کا کام دیتے رہے ہیں۔ ماضی قریب کے ہندوستان میں مدارس اسلامیہ ہی اسلام کی حفاظت کے علمبردار و نقیب رہے ہیں۔ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ موجودہ مدارس کی ایک بڑی اور قابل ذکر تعداد اسلام کے دفاعی مراکز کی حیثیت سے وجود پذیر ہوئی تھی۔ چنانچہ دیوبند، ندوہ، اصلاح وغیرہ مسلمانوں کی اسی ضرورت کی پیداوار ہیں۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے مسلمانوں کے ان تعلیمی مراکز میں ثنویت نہیں پائی جاتی تھی بلکہ وہ معاشرہ کی جملہ ضروریات پوری کیا کرتے تھے۔ انھیں سے قوم کو ایک طرف قاضی امام خطیب و مدرس ملا کرتے تھے تو دوسری طرف بہترین وکیل کامیاب تاجر ماہر صناع قابل منتظم بھی یہیں سے فراہم ہوتے تھے۔ تعلیم کا حصول بہت آسان تھا۔ اس کے لئے کوئی فیس نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرہ پورے طور پر ان کی طرف متوجہ تھا اور ان کی ساری ضرورتیں اوقاف اور امراء و حکام کے عطیات سے پوری ہو جاتی تھیں۔

انگریزوں نے چونکہ حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی اس لئے انھیں حقیقی خطرہ بھی انھیں سے تھا۔ اس لئے ان کی پالیسی یہ قرار پائی کہ ہندو کو آگے بڑھایا جائے اور مسلمانوں کی کمر توڑ دی جائے۔ انھوں نے زمینداری ایکٹ کے ذریعے مسلمانوں سے تمام جاگیریں اور زمین چھین کر ہندو مہاجنوں کو دے دیں، فارسی، عربی کو یک لخت دفاتر سے خارج کر دیا، مدارس کے اوقاف ضبط کر لئے۔ اس طرح انھیں جاہل، قلاش اور بے دست و پا بنانے کی بھرپور کوشش کی تاکہ ہر اعتبار سے ان کی کمر ٹوٹ جائے، وہ ابھر نہ سکیں اور انگریزی اقتدار کو چیلنج نہ کر سکیں۔ مسلمانوں کا تعلیمی نظام انتہائی وسیع پیمانہ پر تھا۔ میکس مولر کی تحقیق کے مطابق صرف بنگال میں ۸۰ ہزار مدارس تھے یعنی ہر چار سو کی آبادی پر ایک مدرسہ اور یہ ایک اچھا تناسب تھا۔ (۱)

انگریز نے تدریج کے ساتھ اس نظام پر کاری ضرب اس طرح لگائی کہ دوسرے گورنر جنرل لارڈ کارنوالس نے 1793 میں پہلا قانون بازیافت (Act of Resumtion of 1793) بنایا اس کے ذریعہ بہت سارے اوقاف ضبط کر لئے گئے۔ اس کو کافی نہ پاکر دوسرا سخت تر اور پھر تیسرا قانون بازیافت نافذ کیا گیا۔ لارڈ ہیسٹنگز نے 19-1818 میں ایک اور قانون نافذ کیا اور ضبطیوں کا دائرہ وسیع تر کر دیا۔ پھر آخر میں لارڈ ولیم بینٹنک نے آخری قانون بازیافت نافذ کیا جو گویا کہ اس نظام کے لئے ولیم ہنٹر کے الفاظ میں ضرب مرگ (Death Blow) تھا (۲) اس طرح صرف ۱۸ سالوں کے اندر ہی اس نظام کے کس بل نکل گئے، علماء کا پورا طبقہ قلاش ہو کر رہ گیا۔ مدارس انتہائی سرعت کے ساتھ بند ہوتے چلے گئے، ایک ایک سال میں ایک ہی تحصیل میں سات سات سو مدارس بند ہو جاتے تھے۔ جو مدارس بچے پائے جاتے گئے وہ کم و بیش نامساعد حالات اور حکومت کے عدم تعاون کی وجہ سے ایک منفی طرز فکر کا شکار ہو گئے۔ ان کے اندر تعلیمی ثنویت کا رواج ہو گیا۔ حالات جیسے کچھ تھے ان میں ایسا ہونا فطری تھا انگریز سے مسلمانوں کو شدید نفرت ان کی ظالمانہ پالیسیوں کی وجہ سے ہی ہوتی تھی دوسرے ہم وطنوں کی طرح انھوں نے انگریزی نظام سے مفاہمت کا رویہ اختیار نہیں کیا، لیکن اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں تھی کہ وہ انگریزی تعلیم اور مغربی علوم کے مخالف تھے، یہ تو دراصل ایک بے حقیقت پروپیگنڈا ہے۔ مسلمانوں کی یہ ذہنیت تو تاریخ کے کسی بھی دور میں نہیں رہی کیونکہ یہ بات ان کے دینی و تہذیبی مزاج کے ہی خلاف ہے۔ ہاں شروع میں انگریزی اسکولوں سے ان کے تنفر کی اصل وجہ یہ تھی کہ یہ سرکاری اسکول اصلاً مسیحی تبلیغی مشن کا ایک حصہ تھے۔ اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد دنیا بھر کی مشنری تنظیموں اور اداروں کو ہندوستان آنے اور اپنے ادارے اور مشن قائم کرنے کی عام دعوت دی گئی تھی۔ حکومت نے پرائمری، ثانوی اور کالج ہر سطح کی تعلیم عیسائی مشنریوں کے ہاتھ میں دے دی تھی اور درسگاہیں عیسائیت کی تبلیغ کا موثر ترین ذریعہ بنائی گئی تھیں۔ ایک مصنف نے لکھا ہے "درسگاہ کا پورا ماحول مسیحی ہوتا تھا۔ اس کا نام کسی مسیحی بزرگ کے نام پر رکھا جاتا تھا جیسے سینٹ جونز، سینٹ اسٹیفن وغیرہ اس کے اندر گرجا ہوتا، عمارت میں جگہ جگہ مسیح اور مریم کے مجسمے لگائے جاتے۔ اساتذہ اکثر پادری ہوتے تھے جن کے سینہ پر صلیب پڑی رہتی۔ ان کو فادر کہا جاتا، طلبہ کے گلے میں لازماً کائی

ہوتی تھی، درسگاہ کا آغاز بائبل سے ہوتا تھا۔" (انتصار ۳)

جہاں تک نئے علوم پڑھنے اور جدید زبانیں سیکھنے کی بات ہے تو مسلمانوں نے کبھی اس کی مخالفت نہیں کی۔ یہ ان کے خلاف ایک پروپیگنڈہ تھا جو انگریزوں نے ہی پھیلایا تھا۔ بعد میں مسلمان بھی اس کو دہرانے لگے۔ دور شاہ عبدالعزیز نے انگریزی سیکھنے کے تعلق سے جواز کا فتویٰ دیا تھا نیز مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے ایک سوال کے جواب میں لکھا تھا "فقط انگریزی کا پڑھنا پڑھانا اگر بلحاظ تشبہ ہو تو ممنوع ہے اور اگر اس لئے ہے کہ ہم انگریزی میں لکھے خطوط پڑھ سکیں اور ان کی کتابوں کے مضامین سے آگاہ ہو سکیں تو اس میں مضائقہ نہیں۔" (۴)

پھر سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ مسلمانوں نے مغربی علوم وفنون کو اکبر ہی کے زمانے سے سیکھنا شروع کر دیا تھا، عبدالرحیم خانخاناں ان میں درک رکھتا تھا، اکبر نے اس کے لئے ایک اسکول بھی کھلوایا تھا۔ جہانگیر اور بعد کے مغل حکمرانوں کے عہد میں بھی بہتیرے لوگوں نے ان علوم کو سیکھا، مغربی کتابوں کا ملکی زبان میں ترجمہ کیا (۵) لیکن انگریز مسلمانوں کو جاہل بنانا چاہتے تھے اس لئے ان سے تمام مراعات بھی چھین لیں ان کو جدید تعلیم گاہیں کھولنے کی اجازت بھی نہیں دی گئی۔ بشپ ہبر نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے "کہ ڈھاکہ کے مسلمانوں نے جدید تعلیم کا ایک اسکول کھولنے کا ارادہ کیا اور حکومت کو درخواست دی لیکن اس پر کوئی توجہ نہیں دی گئی" (۶) یہاں تک کہ ان کے اوقاف تک غیر مسلموں پر خرچ کر دئے گئے۔ مفتی ولی اللہ فرخ آبادی اور موتمر کے شاہ غلام موسیٰ کے ساتھ بھی یہی حادثہ پیش آیا۔ کلکتہ کے مشہور تاجر ملا محمد حسن نے اپنی ہی ایک درسگاہ کھولنے کا ارادہ کیا ان کو بھی اجازت نہ ملی۔ (۷)

یقیناً مسلمانوں کے زوال میں داخلی عوامل کا ہاتھ بھی ہے لیکن خارجی عوامل کا بھی بڑا رول رہا ہے، المیہ یہ ہے کہ اس کا واویلا تو بہت مچایا گیا لیکن سنجیدگی سے کبھی اس کا تحقیقی جائزہ نہیں لیا گیا۔

اس نازک صورت حال میں دیوبند، علی گڑھ اور ندوہ کی تعلیمی تحریکات چلیں اور اصلاح احوال کی کوششیں ہوئیں، لیکن علی گڑھ تحریک اپنے تمام تر مثبت فوائد کے باوجود ذہنی غلامی کی نذر ہو گئی اور مغربی تہذیب کی نقالی و تقلید ہی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا، دیوبند کے ارباب فکر

صورت حال کا تجزیہ کرتے، انھوں نے مغربی تہذیب و نظام تعلیم کے خطرناک اثرات کا اندازہ تو کر لیا لیکن اس کی وجہ سے وہ منفی طرز عمل کا شکار ہوگئے۔ انھوں نے کلی طور پر اس کو مسترد کرنے کا رویہ اپنایا۔ ظاہر ہے کہ کسی نظام سے مقابلہ کا صحیح طریقہ نہیں تھا۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ مغربی تہذیب سے متوحش ہو کر اس سے دور رہنے، اس کے قریب نہ جانے اور اس سیلاب سے جو گھروں کے دروازوں تک پہنچ چکا تھا، آنکھیں موند لینے کے بجائے اس تہذیب کا گہرا مطالعہ کیا جاتا، اس کو جانا جاتا، اس کے نظام اقدار کا تحلیل و تجزیہ کیا جاتا اور اس طرح شعوری طور پر اس کو رد کیا جاتا۔ اگر ایسا ہو گیا ہوتا اور اس سیلاب کا مقابلہ کرنے کے لئے سنجیدہ کوشش ہوئی ہوتی تو آج صورت حال بالکل مختلف ہوتی۔ ندوہ نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور اپنے نظام تعلیم میں کچھ تبدیلیاں بھی کیں لیکن عصر جدید کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے اس نظام میں جن بنیادی اور دور رس تبدیلیوں کی ضرورت تھی ان کے لئے کوئی واضح اسٹریٹجی نہ اپنائی جا سکی اور قدیم صالح و جدید نافع کے امتزاج کے زبانی دعووں اور جدید عربی ادب سے آگے بات نہ بڑھ سکی۔ اس صورت حال کو سو سال گزر جانے کے بعد بھی مدارس کے نظام میں بعض معمولی اور جزوی تبدیلیوں کو چھوڑ کر اب تک کوئی انقلابی پیش رفت نہ ہو سکی ہے۔ اس موضوع پر لکھا پڑھا بھی جا رہا ہے لیکن عملی اقدامات نہ ہونے کے باعث بات جوں کی توں ہے۔

عصری نظام تعلیم میں ایک مرحلہ تک نصاب میں مکمل یکسانیت ہوتی ہے اور تمام طلبہ کو تمام مضامین پڑھائے جاتے ہیں اس کے بعد اختصاص (Specialization) کا مرحلہ ہوتا ہے اور طلبہ اپنے ذوق و انتخاب سے انجینئرنگ، میڈیکل، آرٹ، کامرس، سائنس یا علوم اجتماعیہ میں جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ باوجود الگ الگ اختصاص کے یہ طبقہ اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی پر قادر ہوتا ہے۔ ایک انجینئر اور ایک ڈاکٹر دونوں کی فیلڈ الگ ہوتی ہے لیکن دونوں ایک دوسرے کو سمجھ سکتے ہیں اور سمجھا سکتے ہیں، اپنے خیالات کو بآسانی دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں لیکن مدارس کی پیدا کردہ نسل معاشرہ کے پڑھے لکھے طبقات تک اپنے خیالات کی ترسیل کرنے اور ان سے تبادلۂ افکار میں ناکام ہے۔ اس کی وجہ دراصل مدارس کے نظام کی ثنویت ہے۔ جہاں ان کو معاشرہ سے بالکل الگ تھلگ ماحول میں رکھا جاتا ہے۔ ان کو جو چیزیں پڑھائی ہوتی ہیں وہ موجودہ معاشروں کے صرف

... زندگی کے متنوع گوشوں اور میدانوں میں کچھ کام نہیں آسکتی ... لیکن معاشرہ میں کوئی ایجابی و تعمیری فعال رول ادا کرنے سے قاصر ... اسلامیہ کی سب سے بڑی ضرورت تعلیمی ثنویت کو ختم کرنا ہے۔ حل یہ ... کے پورے نظام کو اختیار کر لیا جائے کیونکہ وہ پورا نظام سیکولرزم ... بھی الگ ہیں، اس کے مقاصد تعلیم بھی مقاصد اسلام سے ٹکراتے ... تعلیم ایک معاشرتی اور مقصدی عمل ہے اس کے ذریعہ نئی نسل کو معاشرہ ... اطوار سکھائے جاتے ہیں، جو اساتذہ کے ذہنوں میں راسخ ہوتے ہیں انھیں کو ... ہر نظام تعلیم میں یہ اقدار پائے جاتے ہیں۔ ماہرین، اساتذہ اور لٹریچر، نصاب ... انھیں کے ترجمان ہوتے ہیں، پھر چونکہ کوئی بھی معاشرہ صرف ایک انسانی بھیڑ نہیں ہوتا ... ایک جسم نامی (Organism) ہوتا ہے اس جسم میں ایک مرکزی تصور بمنزلہ روح کے ہوتا ... اور اس کے تمام اعضاء اسی سے غذا پاتے ہیں۔ یہ مرکزی خیال انسانی زندگی کے بنیادی حقائق (انسان، کائنات، خدا اور آخرت) کے بارے میں فکر و تخیل کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اسی مجموعہ کو Ideology بھی کہتے ہیں، یہی آئیڈیالوجی معاشرہ کی روح ہوتی ہے، اور نظام تعلیم چونکہ خارج سے ... جانے والی چیز نہیں ہوتی اس لئے کسی بھی معاشرہ میں وہی نظام تعلیم فروغ پا سکتا ہے جو ... کی آئیڈیالوجی سے ہم آہنگ ہو۔ اب دیکھا جائے کہ مغرب کے مسلمہ تعلیمی اقدار یہ ہیں (۱) ...یت (۲) غیر جانب داریت (۳) مطلق آزادی (۴) واقعیت پسندی (۵) زمانہ پرستی (۶) قوم پرستی (۷) افادیت پرستی (۸) زر قابل قدر (۹) جنس بازار پر اخلاقی صفات مثلاً ... ایمانداری، سچائی وغیرہ۔ بظاہر یہ اقدار بڑی خوشنما معلوم ہوتی ہیں لیکن ان کا تحلیل و تجزیہ کیا ... تو معلوم ہوگا کہ یہ بڑی خطرناک اور گمراہ کن اقدار ہیں۔ سر دست اس کی گنجائش تو نہیں اس ... مختصراً اسلامی نظام تعلیم کے اقدار کا ذکر کرنا مناسب ہوگا۔

اسلامی نظام تعلیم کے اصولیات میں نمبر (۱) تمام علوم کا منبع اور معلم حقیقی اللہ ہے (۲) تمام انسانی تجربی علوم انسانی ضرورت ہیں لیکن وہ انسان کا مطلوبہ ارتقاء نہیں کر سکتے (۳) وحی پر مبنی علوم ہی انسان کو حقیقی ارتقاء دے سکتے ہیں (۴) دین و دنیا کی تقسیم کو سرے سے قبول

نہیں کرتا البتہ تجربی اور معنوی علوم کی تقسیم کا قائل ہے۔ لیکن وسیلہ اور مقصد کے تناظر میں دونوں کا حصول ضروری قرار پاتا ہے (۵) اس نظام میں علم اور تعلیم کا مقصد صرف سیکھنا سکھانا ہی نہیں بلکہ اس کی غایت اصلی انسان کو دنیا و آخرت میں کامیاب بنانا ہے۔ اس لحاظ سے اس میں ایک طرف تو انسان کی کلی شخصیت کا تصور ہوتا ہے، دوسری طرف انسان کا اللہ کے سامنے مکمل خود سپردگی کا نظریہ۔ (۸)

اسی طرح تعلیم کے مقاصد کی تعیین کا بھی مسئلہ ہے، جہاں تک جدید تعلیم کے مقاصد کا تعلق ہے تو وہ مسلسل بدلتے رہے اور ترقی پذیر ہوتے رہے ہیں، زمانے کے ساتھ ساتھ ان میں حذف و اضافہ ہوتا رہا ہے، تاہم بیسویں صدی میں عام طور پر دنیا بھر میں چند مقاصد کی تعیین کی گئی ہے جن کی تعبیر دو درجوں (۱) قریبی مقاصد (۲) حقیقی مقاصد سے کی جاتی ہے، قریبی یہ ہیں (۱) فلاح عام (۲) مسرت کا حصول (۳) انفرادیت پرستی (۴) زر اندوزی، جیسا کہ ظاہر ہے کہ یہ مقاصد بھی اسلامی نظام تعلیم کے مقاصد نہیں ہو سکتے، لیکن ان کی تعیین بھی ہونی چاہئے، جو بالخصوص ہندوستان کے تناظر میں منحصر ہے اس بات پر کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا مقصد وجود کیا ہے؟ اس سوال کے متعین جواب سے ہی اس امر کا فیصلہ ہو پائے گا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا تعلیمی نظام اور اس کی تفصیلات و ترجیحات کیا ہوں۔ چنانچہ اس کا متعین جواب یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا فریضہ حیات اقامت دین اللہ اور شہادت علی الناس ہے۔ یہ تسلیم کر لینے کے بعد اب یہ سوال خود بخود حل ہو جاتا ہے کہ مدارس کی تعلیم کے مقاصد کیا ہوں، اور مدارس اس کے لئے کیا کریں۔ متعینہ طور پر مدارس اسلامیہ کے مقاصد میں درج ذیل چیزیں ہونی چاہئیں۔

(۱) اسلام کے فکری و علمی ورثہ کی حفاظت اور توسیع (۲) معاشرہ کی موجودہ اور آئندہ ضروریات کی تکمیل (۳) اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے آئندہ کے فکری و علمی چیلنج کا سامنا کرنے کی ضروری تیاری۔ (۹)

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ مدارس مقاصد کے تعلق سے بے سمتی کا شکار رہتے ہیں، طلبہ پر ابتداء سے انتہا تک مقصد سے بے خبری رہتی ہے، لہٰذا یہ بات انتہائی حد تک ناگزیر ہے کہ مذکورہ بالا مقاصد ان کے ذہنوں میں اچھی طرح بٹھائے جائیں اور وہ مدارس کی چہار دیواری

سے اپنی زندگی کے لئے انھیں اعلیٰ مقاصد کو لے کر میدان کار میں آئیں۔ ان مقاصد کے حصول کے سلسلہ جو طریقہ کار اپنایا جائے گا اسے ایک خاص طریقہ پر چار مراحل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، مدارس کی تعلیم کو مرحلہ وار بنانا مفید ہوگا، اس سے وسائل کی بچت بھی ہوگی، صلاحیتیں بھی ڈیولپ (Develop) کی جا سکیں گی۔ آسانی کے لئے ہم ان مراحل کو اس طرح واضح کر سکتے ہیں

پہلا مرحلہ: اس میں طالب علم کو اتنی معلومات دی جائیں کہ وہ ایک مومن و مسلم کی زندگی گزار سکے، اس مرحلہ میں ذریعہ تعلیم مادری زبان ہو، دعوت دین کا داعیہ اور اس کی کم از کم مطلوبہ صلاحیت بھی طالب علم کے اندر پیدا کی جانی چاہئے۔ اس مرحلہ میں اور دوسرے علوم کی مبادیات پڑھا دی جائیں، اس مرحلہ کا انتخاب انتہائی دقت نظری سے تحقیق کے بعد متعین کیا جائے۔

دوسرا مرحلہ: طالب علم میں اتنی استعداد پیدا کر دی جائے کہ وہ معاشرہ کی رہنمائی، روزمرہ کے مسائل میں کر سکے، اس مرحلہ سے ہی اکثر طلبہ تعلیم چھوڑ کر عملی زندگی میں قدم رکھ دیتے ہیں لہٰذا ان کے اندر استعداد پیدا کر دینا لازمی ہے کہ وہ مزید مطالعہ کر کے آگے بڑھ سکیں، اسی مرحلہ میں ذہین، محنتی اور سنجیدہ طلبہ کو عام طلبہ سے چھانٹ کر الگ کر دینا بھی ضروری ہے تاکہ وہ آئندہ کے دو مراحل میں جا سکیں جن میں از حد ذہین و شوقین طلبہ لئے جائیں، کیونکہ ان میں طلبہ کی بھیڑ بڑھانا اصل مقصد نہیں ہونا چاہئے۔ اسی دوسرے مرحلہ میں طلبہ کو اصلاح و تبلیغ کے لئے مفید فنون مثلاً خطابت، تحریر وغیرہ کی باقاعدہ اور فنی تعلیم دی جائے نیز اسی کے ساتھ ہی مناسب ٹیکنیکل تعلیم بھی انھیں اسی مرحلہ میں دے دینی چاہئے، عصری علوم سے مناسب حد تک ان کو آشنا کرانا حد درجہ مفید ہوگا، اور تبلیغ دین کی عملی مشق بھی ان کو کرائی جائے۔

تیسرا مرحلہ: اس مرحلہ میں ہر کس و ناکس کو لینا نقصان دہ ہوگا، باریک بینی سے چھان پھٹک کے طلبہ کو لیا جائے، کمیت سے زیادہ کیفیت پر دھیان دیا جائے اور کوشش کی جائے کہ دینی علوم پر ایسی قدرت طلبہ کے اندر پیدا ہو جائے کہ وہ براہ راست مصادر سے اخذ کر سکیں ساتھ ہی انھیں مسائل عصر اور جدید علوم سے واقف کرایا جائے، اجتہادی فکر، اس کے نمائندہ مکاتب فکر و شخصیات، اسلامی تحریکات اور جدید اجتہادی فکر سے ان کو واقف کرانا ایک ناگزیر امر ہوگا۔

چوتھا مرحلہ: تیسرے مرحلہ کے منتخب ترین طلبہ پر مشتمل ہوگا جو علوم میں ایسا علمی رسوخ پیدا کر

دیا جائے کہ وہ دینی علوم میں اضافہ کر سکیں اور مرجع کا کام دیں۔ چونکہ یہ مرحلہ اختصاص کا ہوگا اس لئے ان طلبہ کو عصری اجتماعی علوم میں سے کسی ایک کا انتخاب کرکے گہرائی کے ساتھ اس کو پڑھنا ہوگا۔ (۱۰)

آج مدارس اسلامیہ کا پورا نصاب بغیر کسی درجہ بندی کے چل رہا ہے اور اگر کہیں کوئی درجہ بندی ہے بھی تو وہ نہایت ناقص ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ مذکورہ بالا خطوط پر نئے سرے سے اس پورے نظام کو استوار کر دیا جائے۔ صلاحیتوں کا انتخاب ہو، وسائل کا مناسب استعمال ہو، وقت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے، امت کی نشاۃ ثانیہ کے لئے یہ کام نہ صرف یہ کہ ضروری ہے بلکہ اس کی اولین ترجیح کا مستحق ہے۔

نصابی کتب اور طریقہ تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں بھی بعض اصلاحات ناگزیر ہیں۔ اس ضمن میں چند تجاویز پیش کی جاتی ہیں (۱) مدارس کے لئے ایک مکمل اور نیا نصاب تیار کیا جائے، بالخصوص پہلے اور دوسرے مرحلہ کے لئے تمام کتابیں نئی ہوں، ماہرین کی ایک ٹیم انھیں تیار کرے، جس میں طلبہ کی عمر، ذوق اور نفسیات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہو (۲) زبان و ادب کی تعلیم براہ راست (Direct Method of Ed) ہو، اور صرف و نحو پر انحصار کم سے کم ہو (۳) نصاب جامع ہو لیکن کتابوں کا بوجھ کم سے کم ہو (۴) معلمین کی تدریسی تربیت کی جائے، تدریس کے لئے نئی تحقیقات اور تکنیک سے لازماً استفادہ کیا جائے (۵) طلبہ کو مناسب حد تک آزادی دی جائے، ہمارے مدارس بالخصوص مکاتب و حفظ کے مدرسوں میں غیر ضروری سختیوں سے طلبہ کی ذہنیت کو پست اور ان کی شخصیت کو کچل دیا جاتا ہے، اور تادیب کے وہ طریقے اختیار کئے جاتے ہیں کہ بہتیرے لڑکے نہ صرف یہ کہ استاذ کی صورت سے خوف کھاتے اور گھبراتے ہیں بلکہ اسی وجہ سے تعلیم چھوڑ دیتے ہیں (۶) تیسرے اور چوتھے مرحلہ میں طلبہ کو ذہن تحقیقی بنایا جائے، انھیں غور و فکر کرنے اور کتابوں پر انحصار کے بجائے ذاتی اکتساب و تجربہ پر زور دیا جائے۔

اسی طرح اسلامی خطوط پر تعلیم و تربیت کا ایک ہمہ جہتی اور مربوط نظام بنا کر مدارس کے پورے سلسلہ کو ایک نہایت درجہ مفید تعمیری ملی ادارے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے جس کے اثرات ملت کے ہر شعبہ زندگی پر پڑیں گے اور جو صحیح معنی میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے نشان راہ بن جائے گا۔

مراجع:

۱۔ ڈاکٹر محمد اسلم — برصغیر میں مغربی زبانوں کے ماہر علماء، علی گڑھ سے پہلے، صفحہ ۱۰، لاہور
۲۔ ایضاً صفحہ ۱۱
۳۔ ایضاً صفحہ ۱۱
۴۔ ایضاً صفحہ ۱۳، ۲۲، ۲۶ نیز مجموعہ فتاوی عبدالحی فرنگی محلی ج ۲ صفحہ ۸۰
۵۔ ملاحظہ ہو ب ۲ صفحہ ۲۹ تا ۳۶ نفس مصدر
۶۔ ایضاً صفحہ ۱۵
۷۔ ایضاً صفحہ ۱۵، ۱۶
۸۔ اسرار عالم — مدارس عربیہ کے لئے رہنما اصول، صفحہ ۹
۹۔ اسرار عالم — " " " ۱۲
۱۰۔ نجات اللہ صدیقی — تحریک اسلامی عصر حاضر میں — صفحہ ۲۱۹ تا ۲۲۸

غزل

ریاض احمد قاصد فلاحی

یہ غم کے مارے خوشی کی شراب کیا دیں گے
سکونِ دل انہیں خانہ خراب کیا دیں گے

گھروں میں جن کے نہیں ہیں دیئے بھی مٹی کے
وہ کم نصیب تمہیں آفتاب کیا دیں گے

جو خار زاروں میں دامن بچا کے چلتے ہیں
وہ اپنی نسل کو شاخِ گلاب کیا دیں گے

جو خواب نیند کی گولی بھی ہو نہیں سکتے
ہماری جاگتی آنکھوں کو خواب کیا دیں گے

فضول جن کی جوانی گذر گئی قاصد
میں سوچتا ہوں خدا کو جواب کیا دیں گے

محمد بن واسع ازدیؒ

یزید بن مہلب کا ایک سپاہی

ابوجلیس ندوی

یزید بن مہلب اپنے عہد کا نامور فاتح اور سپہ سالار تھا۔ ساری دنیا اس کی جنگی مہارت اور بہادری کا لوہا مانتی تھی۔ اس کے چہرے سے تہور و شجاعت کی ایسی بجلیاں چمکتی تھیں جنھیں دیکھ کر دشمن کا زہرہ آب ہو جاتا تھا۔ اس کا عزم و حوصلہ اور قوت و طاقت ناقابل تسخیر تھی، وہ جدھر رخ کرتا فتح و نصرت اس کے قدم لینے کو بیتاب ہوتی۔ اسی وجہ سے اسے اسلام کی بے نیام تلوار کہا جاتا تھا۔

وہ ایک لاکھ فوج لے کر جرجان اور طبرستان کو فتح کرنے کی مہم پر نکلا، فوج میں ایک لاکھ کے علاوہ ایسے لوگوں کی تعداد بھی کم نہ تھی جو محض آرزوئے شہادت یا نیت ثواب و سعادت سے رضاکارانہ طور پر شریک لشکر ہوگئے تھے ان میں سب سے پیش پیش مشہور تابعی محمد بن واسع ازدی بصری تھے، جو عابد بصرہ کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کی ذاتی خصوصیت پر اس خصوصیت نے چار چاند لگا دیے تھے کہ وہ خادم رسول حضرت انس بن مالکؓ کے شاگرد رشید تھے۔

یزید بن مہلب اپنی فوج لیکر دہستان پہنچا جہاں ایک ترکی قوم آباد تھی جس کا زور آزمائی میں کوئی مد مقابل نہیں تھا۔ ان کے قلعے اور کمین گاہیں بہت محفوظ اور مضبوط تھیں۔ ان کا ایک دستہ نبرد آزمائی کے لئے ہر روز میدان میں آتا اور جب دیکھتا کہ مسلمان فوجوں کا دباؤ بڑھ رہا ہے اور وہ خود پسپا ہونے لگے ہیں تو پہاڑ کی چوٹیوں پر اپنی کمین گاہوں میں واپس چلے جاتے اور دوسرے دن تازہ دم ہو کر پھر میدان میں مورچہ سنبھال لیتے، اسی طرح جنگ کی ہولناک تباہی طول کھینچتی رہی اور کامیابی کے امکانات مایوسی کی گرد میں دھندلے پڑنے لگے۔ اسی دوران ایک دیو پیکر نوجوان مست ہاتھی کی طرح جھومتا میدان میں آیا، وہ قوت و طاقت میں فولاد و آہن اور عزم

و استقلال میں جبل کوہ کا معلوم ہوتا تھا۔ وہ مسلمان فوجوں کی صفوں میں گھستا اور مار کاٹ کرتا پار سے اس پار نکل جاتا۔ اس کی یورش اتنی طاقتور اور تیز و تند ہوتی کہ مسلمان فوجوں کو بار بار اپنے مورچے سے پیچھے ہٹنا پڑتا، تمام مسلمان فوجی اس صورت حال سے سراسیمہ تھے کہ اچانک وہ خم ٹھونک کر کھڑا ہو گیا اور مبارزت طلبی کی دعوت دینے لگا، مسلمان فوجوں میں کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ اس کی دعوت کا جواب دینے کے لئے آگے بڑھے۔ محمد بن واسع نے یہ صورت حال دیکھی تو ان کی ایمانی غیرت تڑپ اٹھی، وہ بجلی کے کوندے کی طرح لپکے اور اس کی شہ زوری کے غرور کا سر کچلنے کے لئے آگے بڑھے، ان کی لاغر بدنی کا یہ کس بل دیکھ کر مسلمان فوجوں کی ہمت کو آنچ آئی، ایک فوجی آگے بڑھا ان کو اللہ کی قسم دیکر کہا کہ یہ کام اس کے لئے چھوڑ دیں۔ انھوں نے اس کو دعا دی اور کہا جو تمہاری تلوار اس کے سر کا مقدر ہے۔

دونوں شہسوار آمنے سامنے ہوئے، پہلی نگاہ ہی میں دونوں نے ایک دوسرے کی طاقت و قوت کا اندازہ لگا لیا، ترکی فوجی ہر اعتبار سے فائق تھا، مسلمان سپاہی ہر اعتبار سے کمتر۔ دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ ایک طرف فولاد و آہن کی چلتی ہوئی طاقت ہے اور دوسری طرف صرف ایمان و یقین کا سرمایہ۔ پھر یکایک دونوں بھوک سے بادلے شیر کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹے اور مسلسل ایک گھنٹہ تک جان سے بے پرواہ ہو کر اپنے تیغ و تبر کی آگ برساتے رہے۔ دونوں طرف کے فوجیں اپنے اپنے بہادر کی جنگی اداؤں پر نثار ہوتی رہی اور امید و بیم کی کیفیت میں زیر و زبر ہوتی رہیں۔

صورت حال نے سب کو سمجھا دیا تھا کہ یہی مبارزت فتح و شکست کا پیمانہ ہے، اس لئے دونوں طرف خوف و رجاء کے تلاطم میں جذبۂ دل پیچ کھا رہا تھا، سارا ماحول خوف کے سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا، تلواروں کی باہمی ٹکراؤ کے سوا میدان میں کوئی دوسری آواز نہیں تھی، ایک گھنٹہ تک لگاتار جنگ آزمائی کے بعد اب تلواروں کے ٹکرانے کی مدھم آوازیں بتا رہی تھیں کہ دونوں شہسوار اب تھک چکے ہیں اور شاید اب جنگ کسی نتیجہ پر پہنچے بغیر موقوف ہو جائے گی۔ لیکن اچانک مسلمان فوجی نے تکبیر کا نعرہ بلند کیا اور اس تیزی سے حملوں کی بارش کی کہ مد مقابل کے اوسان خطا ہو گئے، پھر دونوں نے سنبھالا لیا، ایک وقت ایک دوسرے کے سر پر تلوار ماری ترکی سپاہی کی تلوار مسلم سپاہی کے خود میں الجھ کر رہ گئی لیکن مسلم سپاہی کی تلوار ترکی سپاہی کے سر میں پیوست ہو

کر اسے دو نیم کرتی۔

سارا میدان اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھا، مسلم سپاہی کامران ہو کر اپنی فوج میں واپس آیا تو اس کی خود میں گڑی ہوئی تلوار ایک طرف اپنی چمک دکھا رہی تھی اور دوسری طرف اس کے ہاتھ کی اپنی تلوار خون کے دھارے بہا رہی تھی۔ لوگوں نے یہ منظر دیکھا تو بے اختیار پکار اٹھے

بخدا یہ محمد بن واسع کی دعاؤں کا ثمرہ ہے

اب ترکی فوج اپنی ہمت ہار چکی تھی اور مسلمان فوجیوں کے حوصلوں میں نئی بارود بھر چکی تھی پھر اس بارود کا دھماکہ ہوا تو ترکی فوج نے سپر ڈال دیے اور صلح کی عاجزانہ کوشش کرنے لگے۔ ان کے بادشاہ نے اعلان کیا کہ اس کی اور اس کے اہل خاندان کی جان بخشی کی جائے، وہ اپنا ملک اور اس کی تمام دولت سے ان کے حق میں دستبردار ہوتا ہے۔

یزید نے صلح کی درخواست اس شرط پر منظور کر لی کہ سات لاکھ درہم ادا کئے جائیں جن میں چار لاکھ نقد ہوں اور باقی بالاقساط، اس کے علاوہ چار لاکھ زعفران سے لدے ہوئے اونٹ اور چار لاکھ آدمی جن کے ہاتھوں میں چاندی کا پیالہ ہو اور سر پر ریشمی کلاہ کے ساتھ دو رومال، ایک مخمل جسے مرد استعمال کر سکیں اور ایک ریشمی جو عورتوں کے استعمال میں آ سکے۔

یزید بن مہلب نے اپنے خازن کو حکم دیا کہ تمام اموال غنیمت شمار کر کے ان کا حساب پیش کیا جائے تاکہ حقوق کی تعیین حق وانصاف کے مطابق انجام پائے اور ہر حقدار کو جلد از جلد اس کا حق دے دیا جائے، خازن اور اس کے کچھ مددگار مال غنیمت شمار کرنے لگے لیکن وہ حد شمار سے باہر تھے اس لئے باہمی رضامندی کی تخمینی تقسیم پر عمل کیا گیا۔

اموال غنیمت میں خالص سونے کا ڈھلا ہوا ایک تاج بھی تھا جس پر موتی اور جواہرات کے دیدہ زیب ٹانکے تھے اور حسین وجمیل نقش ونگار سے مزین وآراستہ تھا، جس نے بھی اسے دیکھا اس کی آرزو میں مچل گیا۔ یزید نے اس تاج کو ہاتھ میں لے کر بلند کیا اور تمام فوجیوں کو دکھا کے کہا:

کیا تم میں کوئی ایسا شخص بھی ہو سکتا ہے جو اس تاج کو دیکھے اور اس کو پانے کی تمنا اس کے دل میں نہ تڑپ اٹھے؟

تمام فوجیوں نے یک آواز کہا

ایسا کوئی نہیں ہو سکتا!

یزید نے کہا: میں ابھی تمہیں دکھاتا ہوں کہ امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام میں ابھی ایسے بے نفس لوگ موجود ہیں جو اس تاج پر ہی نہیں بلکہ اس سے بھی بڑی قیمتی سے قیمتی شے کو خاطر میں نہ لائیں۔

اس نے دربان کو آواز دی

دربان آیا تو اس سے کہا محمد بن واسع کو بلاؤ۔

دربان گیا، انہیں ہر چہار جانب تلاش کیا، دیکھا تو لوگوں سے دور ایک گوشے میں کھڑے مصروف عبادت ہیں، وہ فارغ ہوئے تو دربان نے کہا:

سپہ سالار کو آپ سے کچھ ضرورت ہے

وہ اٹھے، سپہ سالار کے پاس پہنچ کر سلام کیا اور ان کے پہلو میں چپ چاپ بیٹھ گئے۔

یزید نے سلام کا جواب دیا، خیریت پوچھی، پھر تاج کو ہاتھ میں اٹھایا اور ان کو دکھا کے کہا: مال غنیمت میں یہ خوبصورت قیمتی تاج بھی تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اسے قبول کر لیں۔

تمام فوجی خوش ہو گئے۔ سب نے تائید کی، محمد بن واسع نے کہا: یہ تاج میرے کسی کام کا نہیں، اس لئے آپ کسی اور کو عنایت کر دیں۔

سپہ سالار نے ان کو قسم دے کر کہا کہ اسے آپ قبول کر لیں یہی ہم تمام لوگوں کی خواہش ہے

یہ اصرار دیکھا تو سمجھ گئے کہ اب لئے بغیر چارہ نہیں، اس لئے لے لیا، پھر اجازت طلب کی اور رخصت ہو گئے۔

تاج لیکر واپس جانے لگے تو کچھ لوگوں نے کہا یہ دیکھو، میاں بڑے متقی بنتے ہیں اور تاج لے جا رہے ہیں۔

یزید نے یہ بات سن لی، فوراً ایک آدمی کو حکم دیا کہ وہ رازدارانہ طور پر چپکے چپکے ان کے پیچھے جائے اور دیکھے کہ وہ تاج کا کیا کرتے ہیں!

وہ آدمی اجنبی بن کر کچھ فاصلے سے ان کے پیچھے چلتا رہا، راستے ہی میں محمد بن واسع کو

ایک آدمی ملا جو مصیبت کا مارا ہوا تھا، اس نے اپنی دکھ بھری کہانی ان کو سنائی اور مدد کی درخواست کی انھوں نے دائیں بائیں نگاہ دوڑائی، جب یقین کر لیا کہ کوئی دیکھ نہیں رہا ہے تو فوراً تاج نکالا اور اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور چلتے بنے۔

پیچھا کرنے والے نے جب دیکھا کہ محمد بن واسع جا چکے ہیں تو دوڑ کر سائل کے پاس پہنچے اور اسے لیکر سپہ سالار کے پاس پہنچے، سپہ سالار کو جب پوری بات معلوم ہوئی تو لوگوں کو مخاطب کر کے کہا:

میں نے آپ لوگوں سے کہا نہیں تھا کہ امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں اب بھی ایسے اللہ والے موجود ہیں جو دنیا کی بڑی سے بڑی چیز پر بھی فریفتہ نہیں ہوتے۔

محمد بن واسع یزید بن مہلب کی سرکردگی میں جہاد کرتے رہے، اسی دوران حج کا زمانہ آگیا، جب حج میں تھوڑے دن ہی باقی رہ گئے تو سپہ سالار سے طالب اجازت ہوئے، انھوں نے خوشی خوشی اجازت دے دی اور کہا کہ آپ کے سفر حج کے اخراجات کے لئے ہم نے خازن کو آرڈر دیدیا ہے، آپ ان سے وہ لے لیں۔

محمد بن واسع نے پوچھا، کیا اتنی ہی رقم سب کو تقسیم کی گئی ہے؟

یزید نے کہا: نہیں

محمد بن واسع نے کہا: تب تو یہ رقم میں نہیں لوں گا۔ میں بھی صرف ایک لشکری ہوں اس لئے جتنا سب کو ملا ہے اتنا ہی لوں گا اس سے زیادہ نہیں۔

پھر ہاتھ ملایا اور رخصت ہوگئے۔

محمد بن واسع کی جدائی کا یزید کو بڑا قلق ہوا، تمام فوجی ان کی معیت کو باعث برکت سمجھتے تھے، ان کی دعاؤں کا سہارا ان کے لئے وجہ اطمینان و تسکین تھا۔ اس لئے سب کی خواہش تھی کہ وہ حج ادا کر کے جلد از جلد واپس آجائیں تاکہ ان کی برکات و فیوض اور ان کی دعاؤں کے طفیل اللہ کی رحمت و نصرت ان کے ہمرکاب رہے۔

ہائے وہ ہستیاں کتنی باعظمت تھیں جو خود کو کمتر و کہتر سمجھتی تھیں لیکن اللہ کے نزدیک ان کا رتبہ بہت بلند تھا اور لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت و عظمت کے فوارے پھوٹتے تھے۔

مذاہب عالم

نصرانیت

آخری قسط

انیس احمد فلاحی

اسلام اور عیسائیت ایک سرسری موازنہ

اسلام اور عیسائیت دونوں ایک ہی سرچشمۂ ہدایت سے نکلے ہوئے ہیں پیروان مسیح نے اصل دین عیسوی میں تحریف کردی ہے جس کی وجہ سے اب ان دونوں مذاہب کی تعلیمات میں زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن اب بھی دونوں مذاہب میں متعدد امور میں یکسانیت و مماثلت پائی جاتی ہے۔ ان امور کو درج ذیل نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

(۱) دونوں مذاہب میں خالق کائنات، عقیدۂ رسالت و آخرت اور جنت و دوزخ کا تصور پایا جاتا ہے

(۲) دونوں مذاہب میں روزوں کی مشروعیت، نماز کی ترغیب، تکفین اور صدقہ و خیرات کی نصیحت موجود ہے

(۳) دونوں مذاہب میں مقامات مقدسہ کی زیارت، حضرت مسیح علیہ السلام کی رسالت، ان کے آسمان پر اٹھائے جانے اور قرب قیامت زمین پر دوبارہ ان کے نزول کا عقیدہ بھی پایا جاتا ہے۔

(۴) پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید بھی دونوں مذاہب میں موجود ہے۔

مشہور حدیث ہے "ابوہریرہؓ نے کہا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بخدا وہ ایمان نہیں رکھتا، بخدا وہ ایمان نہیں رکھتا، بخدا وہ ایمان نہیں رکھتا۔ لوگوں نے ٹھہر کر پوچھا کون اے اللہ کے رسول؟ آپ نے فرمایا وہ شخص ایمان نہیں رکھتا جس کا پڑوسی اس کی ایذا کوشی اور تکلیف رسانی سے محفوظ نہ ہو۔

مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں: خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ، بڑا اور پہلا حکم یہی ہے، اور دوسرا اس کے مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ، انھیں دو حکموں پر توریت انبیاء کے صحیفوں کا مدار ہے۔ (متی ۲۲: ۳۷-۴۰)

مسیحیت اور اسلام میں وجوہ اختلاف

اسلام	مسیحیت
(۱) اسلام کی بنیادی تعلیم توحید خداوندی ہے	مسیحیت کی بنیادی تعلیم عقیدہ تثلیث ہے۔

٢۔ مسیح علیہ السلام اللہ کے بندے اور رسول ہیں	مسیح علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں
٣۔ بعثت مسیح کا مقصد کفر و شرک کی بیخ کنی، ضلالت سے نکال کر اسلام کی روشنی میں لانا تھا۔	مسیح علیہ السلام کا مقصد وجود ہی آدم علیہ السلام کی غلطی سے اولاد آدم کو چھٹکارا دلانا تھا۔
٤۔ اسلام کی اساسی تعلیم ایمان اور عمل صالح کی جانب دعوت ہے۔ "من آمن بالله واليوم الآخر وعمل صالحاً فلهم أجرهم عند ربهم" (سورۃ البقرۃ / ٦٢)	مسیحیت کی اساسی دعوت الوہیت مسیح اور عقیدہ کفارہ پر ایمان لانا ہے۔
٥۔ مسیح علیہ السلام اپنی والدہ کے مطیع و فرمانبردار تھے۔ "وبرا بوالدتي ولم يجعلني جبارا شقيا" (سورۃ مریم / ٣٢)	مسیح علیہ السلام اپنی والدہ کے ساتھ بے ادب اور ان کے فضل و احسان کے منکر تھے۔
٦۔ اللہ تعالیٰ نے روح القدس یعنی جبرئیل کے ذریعہ مسیح علیہ السلام کی تائید و نصرت کی تھی "وأيدناه بروح القدس" (سورۃ البقرۃ / ٨٧)	روح القدس مسیح علیہ السلام کو پھانسی سے چھٹکارا دلانے کے لئے کوئی مدد نہ کی تھی۔
٧۔ مسیح علیہ السلام دیگر انبیاء کی طرح معصوم تھے۔	مسیح علیہ السلام نیک نہیں تھے۔
٨۔ مسیح علیہ السلام گذشتہ نبیوں اور ان کی تعلیمات کی تصدیق کرنے کے لئے آئے تھے	مسیح علیہ السلام نے سابق انبیاء کرام اور رسولوں کو ڈاکوؤں کے گروہ سے تشبیہ دی۔
٩۔ مسیح علیہ السلام دنیا و آخرت دونوں جگہ معزز تھے۔	رومی لشکر نے مسیح کو مارا اور ان کے چہرے پر تھوکے دیا اور پھر تختہ دار پر لٹکا دیا۔
١٠۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے قتل کی سازش کے تعلق سے یہودیوں کی تمام تر تدبیروں کو ناکام کردیا۔	یہودیوں نے آپ کو کوڑے بھی لگائے اور تختہ دار پر بھی لٹکا دیا۔

١١۔ حواریوں نے آپ کی دعوت پر لبیک کہا "قال الحواريون نحن أنصار الله" (آل عمران / ٥٢)	آپ کے شاگرد اور تلامذہ آزمائش کے وقت آپ کو بے یار و مددگار چھوڑ کر بھاگ نکلے۔
١٢۔ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہیں، بندوں کی توبہ قبول کر لیتے ہیں۔	اللہ تعالیٰ جبار اور منتقم المزاج ہیں۔ آدم علیہ السلام کی توبہ کو قبول نہ کرکے اپنے بیٹے کو تختہ دار پر لٹکا کر ان کی غلطی کا بدلہ لے لیا۔
١٣۔ عبادتوں اور دعاؤں کی قبولیت کے لئے کسی واسطہ کی ضرورت نہیں ہے۔	توبہ اور عبادات پوپ کے واسطے سے ہی قبول ہوتی ہے۔
١٤۔ اسلامی شریعت رشد و ہدایت کا منبع ہے۔	شریعت مسیحیوں کی نظروں میں ایک لعنت ہے۔
١٥۔ اسلام کی نظر میں انبیاء اور رسل اللہ کے نیک بندے تھے۔	عہد نامہ جدید و قدیم کی نظر میں انبیاء کرام عام لوگوں سے بھی گھٹیا کردار کے مالک تھے، چنانچہ بعض نے اپنی بیٹی کے ساتھ زنا کر لیا تو بعض شراب پی کر لوگوں کے سامنے ننگے ہوگئے۔
١٦۔ عصمت صرف انبیاء کرام کو حاصل ہے۔	عصمت صرف پوپ کو حاصل ہے۔
١٧۔ شریعت اسلامیہ ایک ابدی شریعت ہے جس میں ردوبدل کا حق کسی انسان کو حاصل نہیں۔	پاپا کو مسیحی شریعت میں تبدیلی کا حق حاصل ہے۔
١٨۔ قرآن مجید اللہ کی نازل کردہ کتاب ہے۔	اناجیل اربعہ مسیحیوں کے نزدیک فلاں اور فلاں کی تالیف ہے۔

اس سرسری موازنہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ نصرانیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی شان کو گھٹانے میں کس قدر بے حیائی سے کام لیا اور ان کو ذلیل ترین مقام پر پہنچا دیا۔ اور اسلام نے ان کی شان بڑھائی اور ان کے مرتبہ میں اضافہ کیا، ان تمام تہمتوں سے آپ کے دامن کو صاف کیا جنھیں نصرانیوں اور عیسائیوں نے آپ کے سر تھوپ دیا تھا۔

ذکرِ جلیلؒ ضمیمہ (۲)

عبد البر اثری فلاحی

عربی زبان جو قرآن و سنت کی زبان ہے اور جس میں اسلامی ثقافت کا بیشتر ورثہ موجود ہے اسے سیکھنے سکھانے کا مسلمانوں نے ہمیشہ اہتمام کیا۔ اردو زبان جب وجود میں آئی تو اسلامی ورثے کو اس زبان میں بھی منتقل کرنے کا کام شروع ہوا چنانچہ اس ضمن میں عربی اردو لغت کی تیاری کی بھی ضرورت محسوس کی گئی اور مختلف مراحل میں مختلف اہل علم نے اپنے اپنے انداز میں لغات تیار بھی کیں جن سے اب تک استفادہ کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ تمام لغات کافی وشافی اور جامع و مانع نہیں ہیں ہر ایک کے اندر کچھ نہ کچھ نقص اور جھول پایا جاتا ہے۔ بالخصوص قرآن فہمی کی راہ میں ان سے کما حقہ راست رہنمائی نہیں مل پاتی جو لغات اغیار نے تیار کی ہیں انھوں نے تو اپنے نقطہ نظر کے لحاظ سے معانی کو توڑنے مروڑنے کی کوشش کی ہے۔ اور جو لغات اپنوں نے تیار کی ہیں انھوں نے الفاظ قرآنی کے معانی کی تعیین میں مستند ادبی ولسانی ماخذ سے شواہد فراہم کرنے کے بجائے تفسیری روایات سے استفادہ کیا ہے اور الفاظ کی اصل تک پہنچنے اور ان کے نظائر تلاش کرنے کی کم ہی کوشش کی ہے۔ اس لئے اور بھی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ کوئی ایسی لغت تیار ہو جو الفاظ کی اصل سے بحث کرتی ہو اس کے مختلف مدارج کی طرف نشاندہی بھی کرتی ہو۔ مختلف حالات میں جو لسانی تغیرات پیدا ہوتے ہیں ان سے بھی بحث کرتی ہو۔ مستند ماخذ سے ان کے نظائر بھی موجود ہوں اور قرآن کی اصل روح تک رسائی میں معاون بھی ہو۔ چنانچہ مولانا مرحوم جنھوں نے اپنی پوری زندگی قرآن و سنت اور ادب و بلاغت کی تعلیم و تدریس میں گذاری تھی اور جنھیں ہر فن پر وسیع، عمیق اور ہمہ پہلو دسترس حاصل ہوگئی تھی انھوں نے بھی لغاتؒ کے درمیان اس خلا کو محسوس کیا اور ایک لغت کی تیاری کے لئے کمربستہ ہوگئے چنانچہ "الف" "ب" "ت" تک آپ لغت تیار کر چکے تھے جو تقریباً ساڑھے چھ سو صفحات بنتے ہیں۔ آگے کا کام بھی جاری تھا

لیکن ملت اسلامی نے آپ کو بلا لیا اور کام ادھورا رہ گیا لیکن جس قدر بھی تیار ہے وہ ایک قیمتی سرمایہ ہے صحیح اندازہ تو اس کے بالاستیعاب مطالعہ سے ہوگا ذیل کے سطور میں صرف چند جھلکیاں اور معارف پیش کی جا رہی ہیں۔

جہاں کہیں بھی وہ الفاظ آئے ہیں جو قرآن میں بھی استعمال ہوئے ہیں تو عموماً آپ متعلقہ آیات مع حوالہ نقل فرماتے ہیں۔ ان کے معانی اور نظائر وغیرہ کی طرف نشاندہی کرتے ہیں اور ان آیات کے ترجمے بھی کرتے ہیں۔ خود یہ آیات اور ان کے ترجمے خاصے کی چیز ہیں جن سے قرآنی معارف کے نئے نئے گوشے سامنے آتے ہیں اور اس کے اصل مفہوم و مدعا تک رسائی ہوتی ہے۔ اشکالات رفع ہوتے ہیں اور مولانا کی آراء کا علم بھی ہوتا ہے۔

مثلاً لفظ تبّ کے تحت رقم طراز ہیں۔

"تب الشئی ـ تبا و تبباً و تبابا و تبیبا: کٹ جانا، منقطع ہونا: آدمی کا خائب و خاسر اور تباہ ہونا تَبَّتْ يَدُهُ، وہ ہلاک ہوا۔ قرآن میں ہے "تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ" (اللھب آیت ۱) ابولہب کے دونوں ہاتھ (عددی طاقت اور معاشی طاقت) کٹ گئے اور وہ بھی تباہ ہو۔

اس میں صاف واضح ہے کہ مولانا "ید" سے مراد جسمانی ہاتھ نہیں لے رہے ہیں بلکہ مراد قوت کا سرچشمہ لے رہے ہیں اور "یدا" یعنی تثنیہ کی تعبیر اصلاً قوت کے دو بنیادی سرچشموں کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ہے۔

اسی طرح البلاء کے تحت لکھتے ہیں

"البلاء": مصیبت (آزمانے کیلئے) رنج و غم۔ کسی چیز میں انتہائی کوشش کرنا۔ انعام (آزمائش میں پورا اترنے پر) قرآن میں ہے "وليبلي المؤمنين منه بلاء حسناً" (الانفال آیت ۱۷) اور ایسا اس لئے ہوا تاکہ مومنین کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے بہترین انعام دے۔"

"البلاء" انعام کے معنی میں بھی عربی زبان میں آتا ہے۔ یہ مولانا کی قیمتی تحقیق ہے جس سے تفسیری اشکال کا ازالہ بھی ہو رہا ہے اور معانی کا ایک جہاں بھی پیدا ہو رہا ہے۔

لفظ "التنور" کے تحت لکھتے ہیں

"التنور: تنور (تندور)، زمین کی سطح۔ قرآن میں ہے "حتى اذا جاء أمرنا وفار

"التنور" (ہود آیت ۴۰) وہ عذاب کا اور نبی نوح کا مذاق اڑاتے رہے یہاں تک کہ جب ہمارا عذاب آ دھمکا اور ان کے علاقے کی پوری زمین سے پانی ابلنے لگا تو ..... ج تنانیر۔"

تنور سے عموماً مفسرین نے "تنور" مراد لیا ہے لیکن مولانا نے جو ترجمہ کیا اس سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا کو اس سے اختلاف ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ مولانا کے نزدیک کیا درست ہے۔

اسی طرح لفظ "البلاغ" کے تحت رقمطراز ہیں:

"البلاغ: وہ شئی جس کے ذریعہ کسی انتہا، مقصد تک پہنچا جاسکے۔ فی هذا الأمر بلاغ: یعنی یہ بات کافی ہے جس کے بعد کسی دوسری چیز کی ضرورت نہیں۔ قرآن میں سورہ حاقہ کی آخری آیت اور سورہ ابراہیم کی آخری آیت میں قرآن کو اسی معنی میں بلاغ کہا گیا ہے۔

قرآن کی صفت بلاغ سے جس معنی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس سے اس کی معنویت میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے، اور خود قرآن سے قرآن کے علاوہ ادھر ادھر دیکھنے کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

مولانا نے مختلف الفاظ کے معانی کی تفہیم میں احادیث رسول ﷺ سے بھی استفادہ کیا ہے جا بجا حوالے دیے ہیں اور استعمالات پر روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً لفظ "برح" کے تحت لکھتے ہیں:

"برح به فلان" کسی کو بڑا ایذا دینا۔ برح به الضرب سخت مارنا۔ حدیث میں ہے "اضربوهن ضربا غير مبرح" اپنی بیویوں کو۔ اگر وعظ و نصیحت سے کام نہ چلے۔ مارو ہلکی مار (جو زخمی نہ کرے نہ ہڈی توڑے)"

اسی طرح لفظ "بکُؤ" کے تحت لکھتے ہیں:

"بکؤ الرجل، بکاءۃً و بکئاً: فطرتاً کم گو ہونا۔ صفت مذکر بکئٌ ج بکاء مؤنث بکئٌ و بکئۃ ج بکاء و بکایا۔ حدیث میں ہے "انا معشر الانبیاء بکاء" ہم انبیاء لوگ کم گو ہیں، بوقت ضرورت بقدر ضرورت ہی بولتے ہیں"

جا بجا آپ نے اقوال صحابہ سے بھی استفادہ کیا ہے مثلاً لکھتے ہیں الاصطفلین: گاجر (یہ لفظ مکتوب حضرت معاویہ بنام شاہ روم میں آیا ہے) واحد اِصطفلینۃ۔

اسی طرح لفظ بہلۃ کے معنی "لعنت" تحریر کرتے ہوئے ابوبکر صدیق کا مشہور قول

نقل فرمایا ہے "من ولي من أمور الناس شيئاً فلم يعظم كتاب الله فعليه بهلة الله"۔

جاہلی ادب پر بھی آپ کی گہری نظر تھی چنانچہ مختلف معانی کے شمار معلقات اور حماسی شعراء کے کلام سے پیش فرماتے دکھائی دیتے ہیں کیونکہ زبان و بیان کے معاملے میں ان کا استعمال اساس میزان کی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

☆ "البعاع: بادل کے پانی کا بیشتر حصہ۔ امرؤ القیس کا شعر ہے: "والقى بصحراء الغبيط بعاعه" بادل نے اپنا زیادہ پانی صحراء الغبیط میں گرا دیا"

☆ تبزل الشيئ: پھٹنا "تبزل ما بين العشيرة بالدم" (زہیر بن ابی سلمی جاہلی جمہرۃ اشعار العرب) قبیلے کے تعلقات خون کے ساتھ پھٹ گئے یعنی جب تعلقات پھٹے تو اندر سے خونریز جنگ برآمد ہوئی"

☆ البعید (مختلف معانی تحریر فرمانے کے بعد) غیر رشتہ دار۔ جعفی حماسی کا شعر ہے:

ولقد یکون لك البعيد   اخا ويقطعك الحميم

ایسا بھی ہوتا ہے کہ غیر رشتہ دار تیرا بھائی ثابت ہوتا ہے اور قریبی رشتہ دار تجھے کاٹ پھینکتا ہے۔

مولانا نے جا بجا بعض الفاظ کے رائج لغوی معانی پر تردد کا اظہار بھی فرمایا ہے، گرچہ تردد کے اسباب مذکور نہیں ہیں لیکن بہرحال غور کرنے کا مقام ضرور ہے۔ مثلاً "الامی" کے تحت لکھتے ہیں۔

"جس نے کسی مدرسہ میں تعلیم نہ پائی ہو۔ وہ گروہ جو کتاب آسمانی نہ رکھتا ہو۔ مرکزی، ناخواندہ، جاہل۔ اجڈ، گنوار (مجھے ناخواندہ اور جاہل کے قبول کرنے میں تردد ہے) آگے "الامیۃ" پر لکھتے ہیں: ناخواندگی، جہالت (فيه نظر)۔

مولانا کی نظر الفاظ کے لسانی ارتقاء پر بھی تھی چنانچہ حسب موقع اس کی صراحت بھی فرماتے ہیں مثلاً "التلمیذ" کے تحت رقمطراز ہیں۔

"التلمیذ: اہل علم، اہل فن یا کسی صاحب حرفہ کا شاگرد، طالب علم، موجودہ عصری زبان میں کم عمر طلبہ کے لئے مخصوص ہو گیا ہے۔ ج تلامیذ و تلامذۃ"

جدید تقاضوں کے تحت جو بہت سے الفاظ وضع کئے گئے ہیں۔ آپ کی ان پر بھی گہری

نظر تھی اور آپ نے ان کا احاطہ کرنے کی بھی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی وضاحت بھی فرماتے گئے ہیں۔ مثلاً لکھتے ہیں، البہر۔ نزلہ جس میں سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے۔ (وضع کردہ مجمع اللغوی مصر)

☆ برزَ غفلة : اپنے کسی کام کا وجہ جواز بیان کرنا (جدید تعبیر)

☆ المبرّة: مصدر میمی احسان کی جگہ مثلاً ہسپتال، یتیم خانہ، پناہ گزین، کیمپ (جدید تعبیر)

☆ التبشیر : دین کی دعوت (فصیح جدید لفظ) وغیرہ۔

یہ چند پہلو صرف بطور نمونہ تعارف کی خاطر پیش کئے گئے ہیں تاکہ اندازہ لگایا جاسکے کہ کتنا قیمتی سرمایہ ان صفحات میں بند ہے اور یہ امید بھی پیش نظر ہے کہ اے کاش کسی کو توفیق مل جائے جو ان کو آخری شکل دیکر منصۂ شہود پر لاسکے۔ آمین۔

عکس مسودہ

اجنبی عورتوں سے مصافحہ کرنا

انوار قمر فلاحی

سوال: آج کل T.V. پر بعض مسلم سربراہان اجنبی عورتوں سے مصافحہ کرتے نظر آتے ہیں، کیا مردوں کے لئے اجنبی عورتوں سے مصافحہ کرنا از روئے شریعت درست ہے؟

جواب: عورتوں کے لئے اجنبی مردوں سے مصافحہ کرنا اور مردوں کے لئے اجنبی عورتوں سے مصافحہ کرنا کسی بھی حال میں جائز نہیں ہے۔ خواہ عورت جوان ہو یا بوڑھی۔ اس لئے کہ اس میں فتنہ کا احتمال ہے۔

فتح مکہ کے موقع پر بعض عورتیں آپ ﷺ کے پاس بیعت کرنے کے لئے حاضر ہوئیں اور آپ ﷺ سے سوال کیا کہ کیا آپ ہم سے بیعت لینے کے لئے مصافحہ نہیں کریں گے تو آپ ﷺ نے فرمایا "میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا ہوں" (مسند الامام احمد)

وقد اخرج البخاری عن عائشة رضی الله عنها أنها قالت : " ما مست يد رسول الله ﷺ يد إمرءة قط ما كان يبايعهن إلا بالكلام " (صحیح بخاری، تفسیر سورۃ الممتحنہ)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: "اللہ کی قسم، بیعت میں نبی ﷺ کے ہاتھ نے کبھی کسی عورت کے ہاتھ کو نہیں چھوا، بیعت کرتے وقت آپ ﷺ صرف یہ فرماتے کہ میں نے ان باتوں پر تجھ سے بیعت لے لی"۔

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ تمام ہی فقہاء کرام اس کے عدم جواز پر متفق ہیں۔

اہم اعلان

جن کا سالانہ زر تعاون ختم ہو چکا ہے وہ فوراً اپنا زر تعاون روانہ فرمائیں ورنہ آئندہ پرچے کی ترسیل بند کرادی جائے گی (مدیر)

راہِ اعتدال

ابو عبدالرحمن عمار فلاحی

از مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

کتابت و طباعت: عمدہ   قیمت: غیر مذکور   صفحات: ۲۴۰

ناشر: دارالعلوم سبیل الفلاح، جالے، ضلع دربھنگہ، بہار

اغیار کی سازشوں اور اپنوں کی سادہ لوحی کی وجہ سے امت مسلمہ جن فتنوں میں مبتلا ہوئی ہے ان میں سے ایک اہم فتنہ فروعات و جزئیات میں اختلاف کو توسع و ملاطفت سمجھنے کے بجائے اسے غیر ضروری اہمیت دیکر باہم تفسیق و تکفیر کرنا ہے جس کی وجہ سے قوت کار اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے استعمال ہونے کے بجائے فضول بحثوں میں ضائع ہوتی رہی اور دشمنان اسلام اپنا الو سیدھا کرتے رہے۔ حیف کہ اب بھی بعض لوگوں کو اس کا ادراک نہیں ہو پا رہا ہے اور خواہی نخواہی اس کا شکار نظر آتے ہیں۔ ایسے میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب (شیخ الحدیث دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد جو دینی علوم بالخصوص فقہ پر گہری بصیرت رکھتے ہیں) کی "راہ اعتدال" کے نام سے یہ کاوش اس سنگین فتنے کے ازالے کی "بے بدل کوشش" ہے، خصوصاً عام فہم زبان اور جدال و مناظرے کے بجائے نصح و خیر خواہی اور پند و موعظت کے اسلوب نے اس کی افادیت کو اور دوبالا کر دیا ہے۔ اہم مختلف فیہ مسائل و دلائل کا جس انداز سے تقابلی تجزیہ کیا گیا ہے اس سے عام قاری کے لئے بھی راجح مسلک تک رسائی مشکل نہیں رہتی۔ البتہ اس احساس کو دبانا بھی ممکن نہیں رہتا کہ خود مصنف کا رجحان حنفیت کی طرف ہے؛ چنانچہ تقریباً تمام ہی مسائل میں غیر مقلدین (اہل حدیث) کے مسلک کو مرجوح اور احناف کے مسلک کو راجح ٹھہرایا گیا ہے۔ حالانکہ حقیقت واقعہ یوں نہیں ہے۔ آپ نے جن پہلوؤں کو موضوع بنایا ہے وہ یہ ہیں۔ تقلید کی حقیقت، ضرورت، احادیث نبوی اور آثار صحابہ سے اس کا ثبوت، سلف صالحین کا اس پر تعامل اور ترک تقلید کے نقصانات، محدثین، فقہاء، اہل اللہ اور سلف صالحین کی نظر میں امام ابوحنیفہ کا درجہ و مقام، امام کے پیچھے قرأت فاتحہ، آمین، رفع یدین، ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کا

مسئلہ، مردوں اور عورتوں کے طریقہ نماز میں فرق، مسجد اور عیدگاہوں میں خواتین کی آمد، مسافر کا مسنون طریقہ، ایک مجلس کی تین طلاقیں، وغیرہ۔

ان مسائل پر تبادلہ خیال و موازنہ کے دوران کہیں کہیں استدلالات کھٹکتے ہیں ان پر مزید غور و فکر کرنے اور حق تک پہنچنے کی کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً ایک مجلس میں تین طلاق کی بحث میں آیت "الطلاق مرتان ...... [البقرۃ: ۲۲۹]" پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"اس آیت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ طلاق کی تعداد کا تعلق مجلس سے نہیں ہے بلکہ اس بات سے ہے کہ کتنی بار طلاق دی گئی ہے۔ اگر دو بار طلاق دے تو دو طلاق واقع ہوگی، تین بار دے تو تین طلاق واقع ہوگی، خود قرآن مجید میں دوسرے مواقع پر بھی "مرۃ" (بار) کا لفظ اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے گھر میں آمد کے لئے اجازت اور استیذان کے طریقہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا "لیستأذنکم الذین ملکت أیمانکم والذین لم یبلغوا الحلم منکم ثلاث مرات" (النور: ۵۸) تمہارے غلام اور تم میں سے نابالغوں کو تین بار (گھر میں داخل ہونے کے لئے) اجازت طلب کرنی چاہیے۔

اگر کسی بات کے تین دفعہ واقع ہونے کے لئے تین مجلسوں میں اس کا وقوع ضروری ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ گھر میں داخل ہونے کے لئے تین الگ الگ مجلسوں میں اجازت لینا ضروری ہو اور ظاہر ہے کہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں، کوئی بے وقوف ہی ہوگا جو ایسی بات کہے گا" ص ۲۰۸، ۲۰۹

قطع نظر اس سے کہ کس کا مسلک درست ہے اور کس کا نادرست "مرۃ" بمعنی "بار" کے سورہ نور آیت ۵۸ "ثلاث مرات" سے استدلال کیا جانا محل نظر ہے کیونکہ اگر یہ پوری آیت سامنے ہو تو پھر "ثلاث مرات" میں لفظ "مرۃ" کو "بار" کے معنی میں لینا درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ یہاں آگے اس کی وضاحت آرہی ہے جس میں تین اوقات کی طرف اشارہ کرکے بتایا گیا ہے کہ ان اوقات میں غلام اور نابالغ بھی بلا اجازت نہ آئیں۔ گویا یہاں تین بار اجازت طلب کرنے کے بجائے تین مواقع پر اجازت طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پوری آیت اور اس کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

"یا ایها الذین آمنوا لیستأذنکم الذین ملکت أیمانکم والذین لم یبلغوا الحلم منکم ثلاث مرات من قبل صلوة الفجر وحین تضعون ثیابکم من الظهیرة ومن بعد صلوة العشاء ثلاث عورات لکم لیس علیکم ولا علیهم جناح بعدهن طوافون علیکم بعضکم علی بعض کذلك یبین الله لکم الآیات والله علیم حکیم"

ایمان والو! تم سے تمہاری ملکیت کے غلاموں کو اور انہیں بھی جو تم میں سے بلوغت کو نہ پہنچے ہوں (اپنے آنے کے) تین وقتوں میں اجازت حاصل کرنا ضروری ہے۔ نماز فجر سے پہلے اور ظہر کے وقت جبکہ تم اپنے کپڑے اتار رکھتے ہو اور عشاء کی نماز کے بعد، یہ تینوں وقت تمہاری خلوت اور پردہ کے ہیں ان وقتوں کے سوا نہ تم پر کوئی گناہ ہے نہ ان پر تم سب آپس میں ایک دوسرے کے پاس بکثرت آنے جانے والے ہو۔ اللہ اسی طرح کھول کھول کر اپنے احکام تم سے بیان فرما رہا ہے۔ اللہ تو پورے علم اور کامل حکمت والا ہے۔

"ثلاث مرات" کے مذکورہ بالا مفہوم (جو سیاق و سباق متبادر ہے) کے بعد مصنف محترم کا استدلال اس آیت درست نہیں رہ جاتا۔

☆ ☆ ☆

☆ گناہ کرنے کے بعد اس کا اعتراف کرنا ایسا ہے جیسے ایک آدمی جو گڑھے میں گر گیا تھا اپنے گرنے کو خود محسوس کرلے۔

☆ پھر اس کا اپنے گناہ پر شرمسار ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اس گڑھے کو اپنے لئے نہایت بری جائے قرار سمجھتا ہے اور اپنی اس حالت سے سخت تکلیف میں ہے۔

☆ پھر اس کا صدقہ و خیرات اور دوسری نیکیوں سے اس کی تلافی کی سعی کرنا گویا گڑھے سے نکلنے کے لئے ہاتھ پیر مارنا ہے۔

(تفہیم القرآن ج ۲ ص ۲۳۱)

جامعہ کے لیل و نہار

ادارہ

ششماہی امتحان و تعطیل گرما ان شاء اللہ ششماہی امتحان ۸/ مئی ۹۹ء سے شروع ہوگا اور ۲۰/ مئی ۹۹ء کو اختتام پذیر ہوگا۔ طلبہ اسی دن اپنے گھروں کو جائیں گے۔ گرما کی مناسبت سے تعطیل شروع ہوگی اور دوبارہ تعلیم کا آغاز ۱۹/ جون ۹۹ء سے ہوگا۔ واضح رہے کہ موسم گرما کی وجہ سے ہی پہلی ششماہی مختصر اور دوسری ششماہی طویل کردی گئی ہے۔ اسی وجہ سے پہلی ششماہی کا کورس چالیس فیصد اور دوسری ششماہی کا کورس ساٹھ فیصد نصاب پر مشتمل ہوگا۔ اور اسی مناسبت سے ششماہی امتحان کے پرچے چالیس نمبرات کے ہوں گے جبکہ سالانہ امتحان کے پرچے ساٹھ نمبرات کے ہوں گے اور فائنل نتیجے دونوں امتحانات کے نمبرات جوڑ کر تیار کیے جائیں گے۔

اجلاس مجلس شوریٰ و مجلس تعلیمی ۱۲/ اپریل ۹۹ء کو مجلس تعلیمی اور ۱۴/ اپریل ۹۹ء کی شام سے شروع ہو کر ۱۵/ اپریل ۹۹ء تک مجلس شوریٰ کا اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں گذشتہ چھ مہینوں کی کارکردگی کا جائزہ لیا گیا اور دیگر مسائل پر غور و فیصلے ہوئے۔

جناب ریاض احمد صاحب رکن مجلس شوریٰ جامعۃ الفلاح کا خطاب ۱۵/ اپریل ۹۹ء کو بعد نماز ظہر جناب ریاض احمد صاحب رکن مجلس شوریٰ جامعۃ الفلاح نے طلبہ کو خطاب فرمایا۔ آپ مخدوم پورا اعظم گڑھ کے رہنے والے ہیں، دہلی میں مقیم ہیں اور جماعت اسلامی ہند کی مجلس نمائندگان کے رکن بھی ہیں۔ آپ نے [illegible] کو آفاتِ علم سے متنبہ کیا۔ [illegible] رہنمائی فرمائی۔ آپ نے فرمایا کہ "تقویٰ [illegible] ذریعہ ہے، جس طرح ان کا لباس عام انسانوں کے لئے [illegible] ضروری ہے"۔ آپ نے مزید فرمایا کہ "علما [illegible] عام انسانوں کے لئے باعث ہلاکت ہیں [illegible] ہمیشہ دور رہنا چاہیے"

روداد اجلاس شوریٰ انجمن طلبہ قدیم

سکریٹری انجمن

۱۶/اپریل ۹۹ء کو بعد نماز فجر مجلس شوریٰ کا اجلاس مولانا جاوید اشرف صاحب فلاحی کی تلاوت مع ترجمہ قرآن سے شروع ہوا۔ گذشتہ کارروائی کی خواندگی اور توثیق کے بعد اب تک کے کاموں کا جائزہ لیا گیا۔ مولانا صدر الدین صاحب فلاحی پر حیات نو کے خصوصی شمارے کی تیاری کا بھی جائزہ لیا گیا اور طے پایا کہ گرچہ تاخیر ہو لیکن اسے معیاری بنانے کی کوشش کی جائے۔ اس خصوصی شمارے کے لئے ایک مشاورتی بورڈ بھی تشکیل دیا گیا جو درج ذیل شخصیات پر مشتمل ہوگا۔

[۱] مولانا جلال الدین انصر صاحب عمری (شیخ الجامعہ) [۲] مولانا رحمت اللہ اثری صاحب فلاحی مدنی (صدر انجمن) [۳] مولانا عبد الحسیب صاحب اصلاحی (سابق مہتمم جامعۃ الفلاح) [۴] مولانا سلامت اللہ صاحب اصلاحی (سابق نائب صدر مدرس جامعۃ الفلاح) [۵] مولانا رضوان احمد صاحب فلاحی (لندن) [۶] مولانا عبید اللہ صاحب فہد فلاحی (علی گڑھ) [۷] مولانا نسیم غازی صاحب فلاحی (دہلی)

طے پایا کہ حیات نو سے اشتہارات حاصل کرنے اور انتظامی امور کو درست کرنے پر بھی توجہ دی جائے اور اس کے لئے مناسب تدابیر اختیار کی جائیں۔

گذشتہ میقات کا گوشوارہ آمد و صرف پیش کیا گیا اور آئندہ بجٹ کو منظوری دی گئی بجٹ کے مجموعی خسارے کو دیکھتے ہوئے مختلف تدابیر اختیار کیے جانے کے ساتھ یہ بات بھی طے پائی۔ عارضی طور پر بطور تجربہ گاڑی کی بکنگ کے شرائط میں ڈھیل دی جائے۔

ساتویں اجلاس ۲۰۰۰ء کے ایجنڈے کے تحت متوقع تاریخیں ۲۵، ۲۶، ۲۷ فروری ۲۰۰۰ء یا ۲۹، ۳۰ ستمبر و یکم اکتوبر ۲۰۰۰ء یا ۶، ۷، ۸ اکتوبر ۲۰۰۰ء تجویز

کی گئیں۔ بعد میں حالات اور مشوروں کی روشنی میں اسے آخری شکل دی جائے گی۔

حسب روایت اس موقع سے سیمینار کا اہتمام کیا جائے گا جس کا عنوان "ہندوستانی تحریکات اور ان کے اثرات" ہوگا۔ مزید تفصیلات طے کرنے اور پروگرام ترتیب دینے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے جس کے کنوینر مولانا ابو الکلام صاحب فلاحی ازہری ہوں گے۔ کمیٹی درج ذیل ممبران پر مشتمل ہوگی۔

[۱] مولانا ابو الکلام صاحب فلاحی ازہری (کنوینر) [۲] مولانا رحمت اللہ اثری صاحب فلاحی مدنی (صدر انجمن) [۳] مولانا نسیم غازی صاحب فلاحی [۴] مولانا عبد العزیز صاحب سنی فلاحی [۵] مولانا خالد حامدی صاحب فلاحی [۶] مولانا عبید اللہ فہد صاحب فلاحی [۷] مولانا منور حسین صاحب فلاحی [۸] مولانا محمد ابوذر صاحب فلاحی [۹] مولانا عبد المجید اثری صاحب فلاحی۔

آخر میں مولانا ابو الکلام صاحب فلاحی کی دعا پر میٹنگ اختتام پذیر ہوئی۔

حیاتِ نو کی توسیع اشاعت مہم

۲۰/اپریل ۹۹ء کو دفتر انجمن میں صدر انجمن کی زیر صدارت مقامی فلاحی برادران کی میٹنگ ہوئی جو بالخصوص حیات نو کی توسیع اشاعت کی مہم کی منصوبہ بندی کے لئے بلائی گئی تھی۔ اس مہم کے ذمہ دار مولانا محمد انیس صاحب فلاحی ہیں۔ مضافات کے تقریباً ۲۵ گاؤں کے لیے مختلف گروپ تشکیل دیے گئے ہیں اور ہر گروپ کے ذمہ دار بھی مقرر کیے گئے ہیں۔ یہ بات بھی سامنے آئی کہ ترجیحات کے طور پر پہلے اساتذہ و کارکنان سے تعاون حاصل کیا جائے پھر فارغین و فارغات جامعہ سے نیز طلبہ کے واسطے سے ان کے سرپرستوں اور جامعہ کے بہی خواہان سے بھی خصوصی رابطہ کیا جائے پھر عمومی طور پر تمام ہی لوگوں سے رجوع کیا جائے۔ تعطیل گرما سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ملک کے اہم مرکزی شہروں کے دورے کی بھی تجویز آئی جس کا تفصیلی خاکہ جلد ہی ترتیب دیا جائے گا۔

خطوط و رسائل

مکرمی جناب عبدالبر اثری فلاحی صاحب، مدیر حیات نو بلریا گنج اعظم گڑھ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

"حیات نو" کا شمارہ (اپریل ۹۹ء) ملا۔ مجلس ملیہ کے تحت مولانا "امین احسن اصلاحی سیمینار" پر ناقدانہ رپورٹ دیکھی۔ سیمینار کے لئے عنوانات پورے ساٹھ عدد تھے اور ان میں تنوع بھی تھا اور ان عناوین کے اندر ذیلی عنوانات قائم کئے جاتے تو ساٹھ کے بجائے چھ سو ہوتے۔ مولانا اصلاحی کی جماعتی و تحریکی خدمات اور اسی طرح مولانا کی تمام تصانیف کے حوالے سے مطالعہ سامنے آنے کی جو بات آپ نے لکھی ہے اس کے لئے عنوانات موجود تھے مثلاً عنوان نمبر۳۳ تصانیف اصلاحی کا معروضی جائزہ، نمبر۳۴ مولانا اصلاحی کے سیاسی افکار و نظریات نمبر۴۴ مولانا اصلاحی کے علمی افکار کے اثرات بر صغیر ہند و پاک میں نمبر۵۵ مولانا اصلاحی کی ملی و دعوتی سرگرمیاں نمبر۵۸ مولانا اصلاحی اور اصلاحات، اسی طرح آپ عنوان نمبر ۲، ۴۴، ۴۸ اور خاص کر نمبر۴۹ ملاحظہ کریں (فہرست عنوانات آپ کے پاس ہوگی)

مولانا اصلاحی کی جماعتی زندگی سے تعرض نہ کرنے کے باوجود ڈاکٹر تابش مہدی جیسے دیوانے وہ بھی سہ روزہ دعوت جیسے دعوتی و تحریکی اخبار کے ذریعہ سامنے آئے اگر ان کی جماعتی زندگی پر گفتگو کی جاتی تو لامحالہ جماعت سے علیحدگی اور اس کے اسباب پر بھی سیر حاصل گفتگو ہوتی اور یہ خوشگوار امر نہ ہوتا۔

دوسری بات آپ نے مندوبین کے دائرہ کو وسیع کرنے کی کہی ہے اور دوسرے حلقوں سے بھی مدعو کئے جانے کی بات کہی ہے، کاش آپ "دوسرے حلقوں" کی وضاحت فرماتے تو جواب آسان ہوتا۔ ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ ہندوستان کے ہر حلقہ اور ہر مکتبہ فکر کے لوگوں کو دعوت دی گئی تھی بعض حضرات نے معذوری ظاہر کی اور معذوری کے مناسب اسباب بھی بتائے۔ بعض افراد وعدے کے باوجود وقت پر نہ حاضر ہو سکے، انہیں کوئی فوری عذر پیش آیا ہوگا۔

جامعۃ الفلاح تحریک اسلامی کا فکری ادارہ ہے اور وہاں سے پانچ مقالہ نگار جن میں آپ

شریک سیمینار تھے، کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ حضرات نے مولانا کے اسی دعوتی، تحریکی وغیرہ جیسی عنوانات پر مقالے پیش کئے ہوتے جس کی بابت آپ کو زیادہ شکایت ہے۔ سیمینار میں آپ نے پوری "تیج المشرقین" تو دیکھی ہی ہے؟؟

ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی صاحب جیسے "معزز فاضل مقالہ نگار" کو ہم نے "ان بلائے مہمان" کی حیثیت نہ دی بلکہ انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔

مولانا صدر الدین اصلاحی کا فکر فراہی اور مدرسۃ الاصلاح کی نیک نامی میں جو حصہ ہے وہ ہم سب پر اظہر من الشمس ہے، اور ان شاء اللہ انجمن طلبہ قدیم مدرسۃ الاصلاح اپنے مادر علمی کے اس مایہ ناز سپوت کو محض سیمینار کے ذریعہ ہی نہیں بلکہ ہر طرح سے خراج عقیدت پیش کرے گی اور اللہ رب العزت نے چاہا تو سیمینار بھی ہوگا، مگر خود مولانا مرحوم کی تجاویز کی روشنی میں جو انہوں نے بحیثیت صدر انجمن طلبہ قدیم مدرسۃ الاصلاح دیا تھا۔ لیکن آپ کا "یہ خیال کہ مدرسۃ الاصلاح اور انجمن طلبہ قدیم مدرسۃ الاصلاح پر مولانا صدر الدین اصلاحی پر ایک علیحدہ سیمینار قرض ہے جو تا انعقاد واجب الادا رہے گا" محض آپ کا خیال ہے۔ میرے اپنے خیال میں مدرسۃ الاصلاح اور انجمن طلبہ قدیم مدرسۃ الاصلاح سے زیادہ تحریک جماعت اسلامی، جامعۃ الفلاح اور انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح قرض دار ہے اور اس سے مکمل سبکدوشی اگر سیمینار کرا بھی دے تو ممکن نہیں۔ بلکہ میرے خیال میں جامعۃ الفلاح کو اپنی مرکزی لائبریری کا نام مولانا مرحوم سے منسوب کر دینا چاہیے اور ایک ہاسٹل کا نام بھی۔ ساتھ ہی ساتھ ادارہ علمیہ جامعۃ الفلاح میں ایک ایسا شعبہ قائم کرنا چاہیے جس شعبے کے افراد مولانا کی فکر کو پروان چڑھانے کا کام کریں اور انہیں کی نہج پر علمی کام کے ساتھ افراد سازی بھی کر سکیں۔

مولانا صدر الدین اصلاحیؒ جماعت اسلامی کے اساسی رکن تھے اس لئے تحریک اسلامی کے قائدین کو چاہیے کہ مولانا مرحوم کے یادگار کے طور پر اگر کچھ نہیں تو کم از کم مرکزی شوری کے ہال کو مولانا مرحوم سے منسوب کر دیں۔ تاکہ آئندہ آنے والے ارکان شوری مولانا کی اجتماعیت پسندی اور اپنی رائے زبردستی نہ تھوپنے کی روش پر کاربند رہ سکیں۔ والسلام

شفیق الرحمن اصلاحی (رکن مرکزی شوری انجمن طلبہ قدیم مدرسۃ الاصلاح)

فاضل مراسلہ نگار نے جو اسلوب اور زبان اختیار کیا ہے اسے اختیار کرنا تو میرے لئے ممکن نہیں سادہ زبان میں بطور وضاحت چند سطریں رقم کر رہا ہوں۔

وضاحت :

فہرست عنوانات برائے سیمینار مولانا امین احسن اصلاحی آج تک مجھے دستیاب نہیں کہ میں اندازہ لگا سکتا کہ کیا کیا عنوانات متعین کئے گئے تھے اور ان میں کس قدر تنوع اور جامعیت تھی۔ واضح رہے کہ جامعۃ الفلاح سے پانچ مقالہ نگار ضرور شریک سیمینار تھے لیکن راقم اور مولانا محمد اسماعیل صاحب فلاحی بحیثیت مقالہ نگار پہلے سے مدعو نہیں تھے۔ مولانا محمد اسماعیل صاحب فلاحی کو چند دنوں قبل ذاتی طور پر مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب نے لکھنے کے لئے کہا تھا۔ اور راقم تو بغیر کسی مقالے کی تیاری کے محض استفادہ کے لئے حاضر ہوا تھا لیکن بعض احباب کے اصرار پر بروقت مقالہ تیار کر کے مقالہ نگاروں کی فہرست میں شامل ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر پیشگی دعوت دی گئی ہوتی تو ان پہلوؤں پر لکھا جا سکتا تھا جو پہلو چھوٹ گئے حالانکہ وہ اہم تھے۔

مولانا مرحوم کی جماعتی زندگی، علیحدگی اور اس کے اسباب جیسے تاریک پہلو ہی نہیں رکھتی بلکہ جماعت کے خد و خال کی استواری، اس کے فکری لٹریچر کی تیاری، اس کے دفاع اور استحکام میں بے مثال قربانیاں جیسے روشن پہلو بھی رکھتی ہے اور جو بھی اس پر قلم اٹھاتا اس کی ذمہ داری ہوتی کہ وہ ان سارے پہلوؤں سے بحث کرے اس لئے اسے ایک ناخوشگوار امر قرار دینا صرف ایک پہلو پر نظر رکھنے کا نتیجہ ہے۔

جہاں تک وسیع المشربی کا تعلق ہے تو مجھے نہیں معلوم کہ کن کن کو مدعو کیا گیا تھا بہ ظاہر میں جو دیکھنے کو ملا اس سے تو یہی تاثر ملتا ہے۔ رہی بات بطور مثال ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی صاحب کی تو میرے علم کی حد تک انھیں باضابطہ دعوت نامہ نہیں دیا گیا تھا۔ وہ تو پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی صاحب ندوی کے اصرار اور کچھ ذاتی تعلق و دلچسپی کی بنا پر شریک سیمینار تھے۔

اپنی وسیع المشربی اور مدعوین کے دائرے کو وسیع رکھنے کا تذکرہ کرتے ہوئے بطور دلیل آپ نے جامعہ کے پانچ مقالہ نگاروں اور ڈاکٹر عبید اللہ فہد صاحب فلاحی کی شرکت، اعزاز کا

حوالہ دیا ہے۔ آپ کا یہ بیان صاف گواہی دے رہا ہے کہ آپ [illegible] رکھتے ہیں گویا کہ آپ کے نزدیک اساتذہ جامعہ و فارغین جامعہ بھی اغیار میں سے ہیں، حالانکہ ہماری یہ شرکت قربت اور تعلق خاطر کا نتیجہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ایسے اساتذہ و طلبہ بھی شریک ہوئے تھے جنھیں باقاعدہ دعوت نہیں دی گئی تھی۔

مدرسۃ الاصلاح اور انجمن طلبہ قدیم مدرسۃ الاصلاح پر بطور واجب الادا قرض کی شکل میں آمدہ مولانا صدر الدین اصلاحی پر سیمینار منعقد کرنے کو میں نے اپنے خیال ہی کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ لیکن واضح رہے کہ یہ بہتوں کے دل کی آواز ہے۔ ذرا آپ سروے کر کے دیکھ لیں۔ رہی یہ بات کہ جماعت اسلامی ہند، جامعۃ الفلاح اور انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح پر اس ضمن میں کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں یہ ان کے سوچنے کی چیز ہے، اس سلسلے میں مشورے دئے جا سکتے ہیں، لیکن اس سے مدرسۃ الاصلاح اور انجمن طلبہ قدیم مدرسۃ الاصلاح کی ذمہ داریاں ساقط نہیں ہو جاتیں۔ واضح رہے کہ انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ماہنامہ مجلہ حیات تو مولانا مرحوم کی حیات و خدمات پر ایک معیاری اور دستاویزی خصوصی شمارہ نکالنے کی تیاری کر رہا ہے، جو خراج تحسین کی ایک شکل ہے۔ اور علمی و فکری خدمات کو اجاگر کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔

(مدیر)

رپورٹ انجمن طلبہ قدیم قطر یونٹ

۱۸ مارچ ۱۹۹۹ء کو انجمن طلبہ قدیم قطر یونٹ کی ایک میٹنگ ہوئی جس کا آغاز مولانا عرفان احمد صاحب شمسی فلاحی کے تذکیری کلمات سے ہوا۔ آپ نے قربانی کی ضرورت، اہمیت اور مسائل پر روشنی ڈالی۔ بعد ازاں سکریٹری انجمن محمد اکرم فلاحی نے گذشتہ تین سالہ کارکردگی کی رپورٹ پیش کی، اسی طرح خازن نے آمد و صرف سے مطلع کیا پھر چند ضروری امور پر صلاح و مشورے کے بعد میٹنگ اختتام کو پہنچی۔ اس میٹنگ میں تقریباً ۱۵ فلاحی برادران شریک تھے۔